باسمہٖ تعالیٰ

قرآنی قوانین

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

نام کتاب ---------- قرآنی قوانین

مصنف ---------- پرویز

ناشر ---------- طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

---------- 25-B گلبرگ II لاہور 54660 پاکستان

---------- فون : 5753666-5764484 فیکس : 5764484

---------- Email-tluislam@brain.net.pk

---------- web.www.toluislam.com

طابع ---------- دوست ایسوسی ایٹس

مطبع ---------- زاہد بشیر پرنٹرز

پہلا ایڈیشن ---------- اکتوبر 1967ء

دوسرا ایڈیشن ---------- اپریل 1978ء

تیسرا ایڈیشن ---------- فروری 1989ء

چوتھا ایڈیشن ---------- مئی 1998ء

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

مشمولات قرآنی قوانین

عمالِ حکومت

سرکاری ملازمین کے لئے ہدایات

⁂ ⁂ ⁂

متفرقات

معاشیات

بنیادی حقوقِ انسانیت

جرم و سزا کا باہمی تعلق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(پہلا ایڈیشن۔ ۱۹۶۷ء)

میری زندگی کا مقصد قرآنی تعلیم کا عام کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں، میں نے گذشتہ تیس پینتیس برس میں کیا کچھ کیا ہے، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو میں نے اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھا تھا لیکن ان کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ تبویب القرآن کے بغیر یہ سلسلہ ناتمام رہے گا اس لئے اس کام کو بھی مجھے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ تبویب القرآن سے مفہوم کیا ہے، یہ بات سمجھنے کی ہے۔ قرآن کریم کا انداز عام تصنیف و تالیف کا سا نہیں۔ عام کتابیں مختلف ابواب میں منقسم ہوتی ہیں اور مصنف ایک موضوع کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے متعلقہ باب کے تحت تمام و کمال لکھ دیتا ہے۔ لیکن قرآنی تعلیم، بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ساری کتاب میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ کسی خاص موضوع کے متعلق اس کے ارشادات (بتمام و کمال) کیا ہیں تو انہیں آپ کو پوری کتاب سے تلاش کرکے یکجا کرنا ہوگا۔ تبویب سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کی ساری تعلیم کو مختلف موضوعات کے تابع، الگ الگ ابواب میں تقسیم کرکے، اس کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کر دیا جائے تاکہ جو شخص زندگی کے کسی معاملہ کے متعلق قرآنی راہ نمائی حاصل کرنا چاہے، اسے وہ، متعلقہ عنوان کے تحت، یکجا مل جائے۔ یوں تو میں نے اپنی ہر تصنیف میں، قرآنی تعلیم کو پیش کرنے کے لئے یہی انداز

اختیار کیا ہے لیکن چونکہ میری ہر کتاب کا موضوع الگ ہے اس لئے اس میں اسی خاص موضوع سے متعلق قرآنی تعلیم مل سکتی ہے۔ تبویب القرآن میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق قرآنی راہ نمائی یک جا مل سکے گی۔

قرآنِ کریم دیکھنے میں تو ایک مختصر سی کتاب ہے، لیکن اس کی ہمہ گیریت کا یہ عالم ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس میں راہ نمائی موجود نہ ہو۔ اور پھر راہ نمائی بھی ایسی جو ہر زمانے میں، دنیا کے ہر انسان کے لئے قندیلِ راہ بن سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کی، اس انداز سے تبویب کوئی آسان کام نہیں۔ یہ دقتِ نظر اور کاوشِ فکر کے علاوہ، پیہم محنت اور مسلسل وقت چاہتا ہے۔ اور میں اب عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکا ہوں جہاں تیس چالیس سال قبل کے مقابلہ میں بہرحال توانائی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن میں نے، اس کام کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ہاتھ میں لے لیا اور آج کل اسی میں مصروف ہوں۔

(۲) لیکن بادہ خوارانِ خم کدۂ قرآنی کی بے تابیٔ تمنا اس قدر صبر آزمائی فرما دیت" کی حریف کیسے ہو سکتی تھی؛ میں نے تبویب کا کام شروع کیا اور ادھر سے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے کہ اسے جلد از جلد شائع کیا جائے۔ جب ان کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ اس قدر طول طویل مسافت کے لئے کتنا وقت درکار ہوگا تو ان تقاضوں نے سمٹ کر یہ شکل اختیار کر لی کہ قرآنِ کریم کے جن احکام کو ایک اسلامی مملکت کا ضابطۂ قوانین بننا ہو، اور جن اقدار کے تحفظ و تنفیذ کے لئے ایسی مملکت کا وجود ناگزیر ہو، کم از کم اس حصے کو پہلے مرتب کر کے بلا تاخیر سامنے لے آیا جائے (ان مہیز خوردگانِ شوق کا خیال یہ ہے کہ پاکستان میں قرآنی قوانین کا نفاذ اس لئے نہیں ہو سکا کہ اربابِ متعلقہ کے سامنے اس قسم کا مجموعۂ ارشاداتِ قرآنی نہیں ہے۔ بہرحال، مجھے ان پیہم تقاضوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا جس کا نتیجہ پیشِ نظر مجموعہ ہے۔ اسے تبویب القرآن کا طائرِ پیش رس سمجھنا چاہیئے۔

(۳) قرآنِ کریم میں معدودے چند احکام متعین قوانین کی شکل میں دیئے گئے ہیں۔ (ان کا تعلق بیشتر عائلی زندگی سے ہے) اور باقی امور کے متعلق اصولی ہدایات دی گئی ہیں جس کتاب کو ہر زمانے کے انسانوں کے لئے، ہمیشہ تک ضابطۂ ہدایت بننا تھا، اسے ہونا ہی ایسا چاہیئے تھا کہ وہ کاروبارِ حیات کے لئے اصولی حدود مقرر کر دیتی جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کے انسان، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین خود مرتب کرتے۔ یہ اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین عند الضرورت

بدلتے جائیں گے۔ مثال کے طور پر، اسلامی مملکت کے متعلق قرآنی اصول یہ ہے کہ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ۔ "ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پائیں گے"۔ مشاورت کا اصول تو غیر متبدل ہے، لیکن اس مشاورت کی مشینری کس قسم کی ہوگی اور طریق کار کیا، اس کی تفصیل قرآن نے نہیں دی۔ اسے ہر زمانے کی امت، اپنی ضروریات کے مطابق خود مرتب کریگی۔

(۴) جہاں تک قرآن کریم میں متعین کردہ قوانین کا تعلق ہے، ان کی صورت یہ ہے کہ:۔

(۱) چند ایک احکام ایسے ہیں جو "جرائم" کی شق میں آتے ہیں۔ اور ان کی سزا بھی متعین کر دی گئی ہے مثلاً جرم زنا۔

(۲) ایسے احکام جن کی حیثیت تو قانونی ہے لیکن جن کی تعزیری شکل قرآن نے خود متعین نہیں کی۔ مثلاً خمر (شراب)، کہ اسے ممنوع تو قرار دیا گیا ہے لیکن اس کی تعزیری تفصیل خود نہیں دی۔ اسے اسلامی مملکت کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۳) ایسے معاشرتی یا اخلاقی احکام جن کی حیثیت انفرادی ہے۔ مثلاً یہ حکم کہ غیبت نہ کرو۔ اسلامی مملکت ضروری سمجھے تو ان میں سے ضروری احکام کو بھی قانونی شکل دے سکتی ہے۔ یہ احکام میری کتاب "اسلامی معاشرت" میں ملیں گے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں ان احکام و اصولات کو مختلف ابواب کے تابع یک جا کر دیا گیا ہے۔ اس میں نہ تو ان احکام کے فلسفہ اور مصالح سے بحث کی گئی ہے نہ ہی ان کی تشریح کی گئی ہے۔ متعلقہ قرآنی آیات کے حوالے دے دیئے گئے ہیں کہ آپ قرآن کریم سے ان آیات کو نکال کر خود اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس باب میں قرآن کی راہ نمائی اور اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے۔ حوالوں میں اوپر سورت کا نمبر اور نیچے آیت کا نمبر دیا گیا ہے۔ مثلاً ($\frac{3}{12}$) سے مراد ہے سورۃ آلِ عمران کی بارھویں آیت۔ چونکہ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں ایک آدھ کا فرق ہوتا ہے اس لئے اگر مطلوبہ آیت میرے دیئے ہوئے حوالہ میں نہ ملے تو دو ایک آیات پہلے یا بعد میں دیکھ لیا جائے۔

(۴) واضح رہے کہ قرآن کریم کے اصول ہوں یا قوانین، سب غیر متبدل ہیں اور کسی فرد یا مملکت کو ان میں ردّ و بدل کا حق حاصل نہیں۔ اسلامی مملکت ان قوانین کے نفاذ کی عملی شکلیں اور طریق کار کی جزئیات مرتب کر سکتی ہے، (یا جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین وضع کر سکتی

ہے۔ اس طرح جو کچھ اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہو، اسے قانونِ شریعت کہا جائے گا۔

یہ بھی معلوم رہے کہ اسلامی مملکت یہ تو کرسکتی ہے کہ معاشرہ کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر قرآنی احکام کو بتدریج نافذ کرے اور اس طرح رفتہ رفتہ معاشرہ کو صحیح قرآنی قالب میں ڈھال دے، لیکن اسے اس کا حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ بعض احکامِ قرآن سے لے لے اور دوسرے احکام باہر رہے، اور اس مرکب کا نام اسلامی قوانین رکھ لے۔ قرآن کی رُو سے ایسا کرنا سنگین جرم ہے اور دنیا میں رسوائی اور آخرت میں تباہی کا موجب۔ ($\frac{2}{85-86}$)

(۵) میں نے اس مجموعہ کو "معاملات" تک محدود رکھا ہے۔ مقصد اس سے یہ بھی ہے کہ اگر کسی وقت ہمارا نصیبہ جاگا اور مملکتِ پاکستان نے ملک میں قرآنی قوانین نافذ کرنے کا فیصلہ کیا تو ان قوانین کے مرتب کرنے میں یہ مجموعہ ان کی راہ نمائی کرسکے۔ اگر ایسا ہوگیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزی اور جگر سوزی کا صلہ مل گیا۔ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت تک تبویبُ القرآن بھی شائع ہوجائے تو وہ زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی محیط ہوگا۔ اس طرح کسی کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہے گی کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ فلاں باب میں قرآنِ کریم کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ خدا کرے مجھے اس کی تکمیل کی توفیق نصیب ہوجائے۔ لیکن اس وقت بھی آئینِ پاکستان میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ یعنی مملکت کے قوانین کے اسلامی ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ (قرآن) کے خلاف نہ ہوں۔ اس لئے میری یہ کوشش اس وقت بھی یہ معلوم کرنے کے لئے مفید و معاون ہوگی کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔

(۶) لیکن کوئی مملکت محض اسلامی قوانین نافذ کر دینے یا شرعی سزائیں دے دینے سے اسلامی نہیں بن جاتی۔ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ ان مستقل اقدار کے مطابق افرادِ معاشرہ کی نشوونما کرے جو قرآن میں بنیادی طور پر دی گئی ہیں اور انہی کی روح کو اپنے نظام میں جاری و ساری کرے۔ اس اعتبار سے، ایک اسلامی مملکت میں ان اقدار کی اہمیت قوانین سے کم نہیں (بلکہ میرے نزدیک کچھ زیادہ ہی ہے) ان کی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے آخر میں ایک باب میں ان مستقل اقدار کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ انہیں اسلامی نظام یا مسلم معاشرہ کا عروۃ الوثقیٰ سمجھئے۔ شروع میں خود اسلامی مملکت کے خدوخال کو بھی قرآنی روشنی میں مرتب کر دیا گیا ہے۔

(۷) آخر میں اس حقیقت کا دہرا دینا ضروری ہے کہ میں قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ پیش کرتا ہوں وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہوتی ہے جو نہ سہو و خطا سے منزہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ میں میں نے اسی لئے صرف قرآنی آیات کو پیش کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان آیات کے مفہوم سے استنباطِ نتائج کیا ہے۔ اگر آپ کو ان نتائج سے اتفاق نہ ہو تو آپ انہیں نظر انداز کر دیں اور قرآنی آیات پر غور و تدبر کے بعد، خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ میرا مقصد اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق، رہ نوردانِ جادۂ قرآنی کے لئے سہولتیں بہم پہنچانا ہے تاکہ وہ بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ میں ان کا رفیقِ سفر بننا چاہتا ہوں، خضرِ راہ نہیں۔ اور میرے لئے یہی سعادت بہت ہے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

پرویز

اکتوبر ۱۹۶۷ء

مقدّمہ

(طبع ثانی)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا اور اس میں آیات کے صرف حوالے دیئے گئے تھے۔ یہ اس لئے کہ میرا مقصد اتنا ہی نہیں کہ میں نے جو کچھ قرآن سے سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی پہنچا دوں، میرا اوّلین مقصد یہ ہے کہ افرادِ امت میں، قرآنِ مجید کو خود غور و تدبّر سے سمجھنے کا جذبہ پیدا ہو۔ آیات کے حوالوں تک محدود رہنے کا مطلب یہ تھا کہ اربابِ شوق ان حوالوں کی مدد سے قرآنِ کریم سے متعلقہ آیات نکالیں۔ ان کے مفہوم پر غور کریں اور اس طرح قرآنی ارشادات تک براہِ راست پہنچیں۔

وہ کتاب تو بہت مقبول ہوئی لیکن ہر طرف سے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے کہ کتاب میں آیات کا متن بھی درج ہونا چاہیئے۔ اور ان کا ترجمہ یا مفہوم بھی۔ میرے عمر بھر کے تجربہ نے بتایا ہے کہ صدیوں کے ذہنی جمود کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم (بالعموم) فکری محنت و کاوش سے جی چُرانے کی عادی ہو گئی ہے اور "پکی پکائی" چاہتی ہے۔ بنابریں، میں اربابِ ملت کی طرف سے اس قسم کے تقاضوں یا مطالبوں کو بیک شکنِ جبیں حسرد نہیں کر دیا کرتا۔ یہ کہہ کر سرِ تسلیم خم کر دیا کرتا ہوں کہ —

ایں ھم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

۲۔ تبویبُ القرآن کا ذکر طبع اوّل کے پیش لفظ میں آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ میں اُن دنوں،

اس کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہو گیا اور زیر نظر کتاب کی طبع ثانی کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ للہ الحمد کہ تبویب القرآن شائع ہو گئی ہے۔ یہ تین ضخیم جلدوں پر مشتمل تالیف (جن کی مجموعی ضخامت قریب ڈیڑھ ہزار صفحات ہے) کم و بیش اڑھائی ہزار عنوانات کے تابع قرآنی ارشادات کو انسائیکلوپیڈیا کی طرح پیش کرتی ہے۔ اس دائرۃ المعارف کی اشاعت کے بعد، قرآنی قوانین سے متعلق جداگانہ تصنیف کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر اس کے تقاضوں نے بھر شدت اختیار کر لی۔ یوں تو مملکتِ پاکستان میں "اسلامی قوانین" کی باتیں روزِ اوّل سے ہوتی چلی آرہی تھیں لیکن اس سال انہوں نے خاص اہمیت اختیار کر لی اور ان قوانین کے مرتب کئے جانے کا چرچا عام ہونے لگا۔ چونکہ قرآن مجید کو قوانینِ مملکت کی اساس و بنیاد قرار دینے کا مشورہ (بلکہ مطالبہ) میری طرف سے پیش کیا جاتا ہے اس لئے متعارف اور غیر متعارف حلقوں کی طرف سے کہا گیا کہ قرآنی قوانین کے ایسے ضابطہ کا جو ایک (REFERENCE BOOK) کا کام دے سکے، بلا تاخیر شائع کرنا، وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر "قرآنی قوانین" کا تازہ (ترمیم شدہ) اڈیشن شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔

اس اڈیشن میں (ضروری ترمیم و اضافہ کے علاوہ) آیات کا متن بھی دے دیا گیا ہے اور ان کا مفہوم بھی۔ آیات کا متن تو قرآن مجید کا ہے اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے پیش کردہ مفہوم سے اگر کسی کو اختلاف ہو، تو وہ جس شکل میں چاہیں اپنا اطمینان کر لیں۔ اسلامی قوانین تو قرآن کریم کی آیات ہیں، نہ کہ میرا پیش کردہ مفہوم۔ بعض آیات سے میں نے استنباطِ نتائج بھی کیا ہے۔ اس قسم کے استنباط کا حق اور اختیار، دراصل اسلامی مملکت کی مجلسِ قانون ساز کو حاصل ہوگا نہ کہ کسی فرد یا فرقہ کو۔ میرا اخذ کردہ استنباط، اس سمت کی طرف اشارہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

۳۔ کتاب کے پہلے اڈیشن میں، قوانین کے علاوہ قرآنی اقدار بھی شامل تھیں لیکن اب انھیں حذف کر دیا گیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ تبویب القرآن کی اشاعت کے بعد، ان (اقدار) کی جداگانہ اشاعت کی ضرورت نہیں رہی، اور دوسرے اس لئے کہ میں اس کتاب کو مختصر سے مختصر رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تجربہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ (HANDY) کو (REFERENCE BOOK) ہونا چاہیئے تاکہ اس کی ضخامت طبائع میں کسل مندی نہ پیدا کر دے۔ جو حضرات تفصیل کی ضرورت سمجھیں، وہ تبویب القرآن سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۴۔ قرآنی قوانین کا یہ مجموعہ یوں تو تمام افرادِ ملت کے لئے مفید ہو سکتا ہے لیکن وہ حضرات جو کسی نہ کسی نوعیت سے قانون کے ساتھ متعلق ہوں، ان کے لئے یہ بالخصوص راہ نمائی کا موجب ہوگا۔ مثلاً جج صاحبان وکلاء حضرات، حکومت کے شعبۂ قانون سے متعلقین۔ مجالس آئین و قوانین ساز کے ارکان۔ اربابِ صحافت وغیرہ۔ اگر ان میں سے کسی کے لئے بھی یہ موجبِ استفادہ ہو گیا تو وہ میری محنت اور کاوش کا کافی صلہ ہوگا، کہ میرا مقصدِ زندگی خدا کی کتابِ عظیم کو اربابِ علم و بصیرت کی توجہات کا مرکز بنانا ہے۔

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را

اپریل ۱۹۷۸ء

پرویزؔ

امورِ مملکت

۱۔ اقتدارِ اعلیٰ

اسلامی حکومت اور سیکولر حکومت میں فرق یہ ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت میں مملکت کا تمام کاروبار خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتا ہے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ سورۃ یوسف میں ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (12/40)۔ "یاد رکھو! حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔" اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (18/26)۔ "یہ خدا اپنی حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔" اگر کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) حقِ حکومت دے دیا جائے تو یہ شرک ہوگا۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو — کہ وہ لوگوں کو اپنے احکام کا محکوم بنائے۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (3/78)۔ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اُسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم یہی ہونی چاہیے کہ تم سب اس کتابِ خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو بھی تعلیم دیتے ہو اور اس پر خود بھی غور و خوض کرتے ہو، ربّانی بن جاؤ۔" واضح رہے کہ خدا کی طرف سے کتاب اوّلاً نبی کو ملتی ہے اور وہ (نبی) پھر اُسے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس طرح خدا کی کتاب عام لوگوں کو بھی مل جاتی ہے۔ قرآن کریم، پہلے نبی اکرمؐ کو بذریعہ وحی عطا کیا گیا اور اس کے بعد امّتِ مسلمہ کو اس کا وارث بنایا گیا۔ سورۃ فاطر میں ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ (35/32)۔ "پھر ہم نے اپنے منتخب بندوں (یعنی امّتِ مسلمہ) کو اس کتاب کا وارث بنایا۔"

اس امت کا فریضہ یہ ہے کہ یہ اس کتاب کے مطابق حکومت قائم کرے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت، احکامِ خداوندی کے نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، جس نظامِ حکومت میں قانون سازی کا حق انسانوں کو حاصل ہو وہ نظام سیکولر ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ یہی کفر و اسلام کا امتیازی خط ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو لوگ کتابِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

۲۔ ضابطۂ مملکت

اسلامی مملکت کا ضابطۂ آئین، خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مسلم نہیں، کافر ہیں۔ (۵/۴۴) اس کتاب کے علاوہ کسی کا اتباع جائز نہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ۔ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ۔ (۷/۳) اے جماعتِ مومنین! تم اسی ضابطۂ قوانین (قرآن مجید) کا اتباع کرو جسے تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ اس کے سوا کسی کارساز و رفیقِ کار کا اتباع مت کرو۔ (انسانوں کے لئے صحیح آزادی یہی ہے کہ وہ کسی انسان کی نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کریں۔ لیکن بہت تھوڑے ہیں جو اس عظیم حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں)۔

(۲) یہ کتاب (قرآنِ کریم) صاف اور واضح ہے۔ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ (۵/۱۵) تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی آگئی ہے یعنی ایسی کتاب جو بالکل صاف اور واضح ہے۔" راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے بڑی آسان ہے۔ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ .... (۵۴/۳۲) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے اس قرآن کو راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔" اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔ (۴/۸۲) "کیا لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ (اگر یہ غور و تدبر کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ) اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات ہوتے۔" اس میں کسی اختلافی بات کا نہ ہونا بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ یہی نہیں کہ خود اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ یہ ہر اختلافی معاملہ میں حکم بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خدا کی طرف سے کتابیں نازل کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ وہ انسانوں کے تمام اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲/۲۱۳) "انبیاء کے ساتھ کتابیں اس لئے نازل کی جاتی تھیں کہ وہ لوگوں کے تمام اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔"

(۳) یہ کتاب ضابطۂ ہدایت کے اعتبار سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۶/۱۱۶) "جو کچھ تمہارے رب نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے دینا تھا وہ سب اس کتاب میں تکمیل تک پہنچ گیا ہے اور صدق و عدل پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔"

(۴) اس میں کچھ متعین قوانین ہیں اور باقی امور کے متعلق اصولی ہدایات ہیں۔ اس کے متعین قوانین علیٰ حالہٖ نافذ کئے جائیں گے۔ جہاں تک اصولوں کا تعلق ہے، ان کی روشنی میں، ہر زمانے کی اسلامی مملکت، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، خود قوانین مرتب کرے گی۔ یہ اصول غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین، زمانے کے تقاضوں کے مطابق قابلِ تغیر و تبدل ہوں گے۔ یہ وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر خدا نے جملہ جزئی قوانین بھی خود ہی متعین نہیں کر دیئے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتے اور دینِ خداوندی ناقابلِ عمل ہو جاتا۔ جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا ہو اُسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا — یعنی اس کے اصول غیر متبدل ہوں اور ان کی جزئیات قابلِ تغیر و تبدل۔ ثبات و تغیر کے اسی امتزاج سے یہ نظام ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل قرار پا سکتا تھا۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہا کہ:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ۔ (۵/۱۰۱-۱۰۲)

اے جماعتِ مومنین! جن امور کی تفصیل قرآن میں نہیں دی گئی، تم انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ (کیونکہ اگر ہم نے ان کی تفاصیل کو بھی متعین کر دیا تو وہ غیر متبدل قرار پا جائیں گی۔ اور جب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکیں گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا) جب نزولِ وحی کا سلسلہ جاری ہے تو تمہارے اصرار پر اگر ان امور کو بھی ظاہر کر دیا جائے تو یہی صورت پیدا ہو جائے گی۔ لہٰذا، تم اس بات کا خاص طور پر خیال رکھو۔ جو کچھ اس سے پہلے ہو چکا ہے اس سے ہم درگذر کرتے ہیں۔ آیندہ کے لئے تم احتیاط برتو۔ قانونِ خداوندی میں سابقہ سہو و خطا کی معافی اور چھوٹی موٹی لغزشوں پر بردباری کی گنجائش ہے۔

یہ جو تنبیہ کی گئی ہے تو اس لئے کہ اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) نے اسی قسم کے سوالات پوچھنے شروع

کر دیئے تھے (۷/۱۵۷)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اتنی قیود اور پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں جن کا نباہنا مشکل ہو گیا اور انھوں نے ان جزئیات کی پابندیوں سے گھبرا کر اصل دین کا لبادہ ہی اتار پھینکا۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے متعین احکام و قوانین بھی معاشرہ کی حالت کے پیش نظر بتدریج نافذ کئے جائیں گے اور اس طرح اسے (معاشرہ کو) رفتہ رفتہ معیاری بنایا جائے گا لیکن اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ آپ اپنی پسند کیمطابق کچھ احکام قرآن سے منتخب کر لیں اور کچھ احکام غیر قرآنی لے کر دونوں کے مجموعہ کا نام اسلامی ضابطۂ قوانین رکھ لیں یہ بھی کفر ہے۔ یہودی یہی کچھ کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں تنبیہہ کرنا پڑی کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) "کیا تم یہ روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان لے آئے اور اس کے دوسرے حصہ سے انکار کر دیا۔ یاد رکھو! جو کوئی بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گا اور ضابطۂ قوانین خداوندی کے حصے بخرے کرنے لگ جائے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرے گا اور قیامت کے دن اس سے بھی زیادہ شدید عذاب میں مبتلا ہوگا۔"

(۳) ساری امّت شریکِ حکومت ہوگی

اسلامی حکومت کا فریضہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے۔ سورۂ حج میں ہے:-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو ان کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوگا۔

یعنی ان امور کو قانوناً نافذ کرنا جنھیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنھیں وہ صحیح تسلیم نہیں کرتا۔

لیکن قرآن نے یہ فریضہ ساری کی ساری امتِ مسلمہ کا قرار دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے اٹھا کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔" یہی امت وارثِ کتاب اللہ ہے۔ (۳۵/۳۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نظم و نسقِ مملکت کا کام (جسے حکومت کہتے ہیں)۔ امت کے کسی خاص گروہ میں محدود نہیں۔ اس میں پوری امت شریک ہونی چاہیئے۔ اس کی عملی صورت کے لئے کس قسم کی

مشینری وضع کی جائے گی، قرآن اسے امت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے۔ مشینری کوئی بھی ہو، مقصود اس سے یہ ہوگا کہ امورِ مملکت کی نشاندہی میں پوری امت شریک ہوگی۔ یعنی اسلامی مملکت کے دائرۂ اقتدار میں بسنے والے تمام مسلمان۔ غیر مسلم اس میں شریک نہیں ہو سکتے اس لئے کہ جس حکومت کا فریضہ احکامِ خداوندی کا نافذ کرنا ہو اس میں وہ لوگ کیسے شریک کئے جاسکتے ہیں جن کا ان احکام پر ایمان ہی نہ ہو۔

(۴) مشاورتی نظام

جس نظام میں پوری امت شریک ہو اُسے قرآن، مشاورتی نظام سے تعبیر کرتا ہے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ارشادِ خداوندی ہے۔ یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ یہ نظامِ مغرب کے نظامِ جمہوریت سے اس بنا پر مختلف ہوگا کہ مغربی نظام میں، قوم یا قوم کے نمائندوں کو قانون سازی کے کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس میں اقتدارِ اعلیٰ قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اسلام کے مشاورتی نظام میں، اقتدارِ اعلیٰ کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔ قوم کے نمائندوں کی اکثریت تو ایک طرف، پوری کی پوری قوم بھی نہ اس کے خلاف کوئی قانون وضع کر سکتی ہے نہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکتی۔ اس نظام کے مخالفین، رسول اللہ سے کہتے تھے کہ اگر آپ اس قرآن میں ہماری منشا کے مطابق کچھ تبدیلی کر دیں تو ہم مفاہمت کے لئے تیار ہیں۔ اس کے جواب، خود اللہ تعالیٰ نے، رسول اللہ سے کہا کہ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ. اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۱۰/۱۵) ان سے کہہ دو کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر میں اس کی ذرا سی بھی خلاف ورزی کروں تو خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے جو سزا مجھے ملے گی میں اس سے بہت ڈرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب خود رسول بھی اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا تو کسی اور کو اس کی اجازت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ باقی رہا جمہوری نظام کی اکثریت و اقلیت کا جھگڑا، تو بات بالکل واضح ہے کہ جب حکومت کا ہر فیصلہ قرآنِ مجید کے مطابق ہونا ہے تو اس میں آراء شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تصور کہ اکثریت کے فیصلے حق پر مبنی ہوتے ہیں، باطل اصول ہے۔ نبی اکرمؐ سے ارشاد ہوا۔ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۷) "اگر تم کسی بات کو محض اس لئے حق مان لو اور اس کا اتباع کرنے لگ جاؤ کہ اکثریت ایسا کہتی ہے تو یاد رکھو! یہ روش تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دیگی۔ دنیا کی اکثریت کا تو یہ عالم ہے کہ یہ لوگ محض ظن وتخمین

کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور قیاس آرائیوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔" حق و باطل کا معیار اکثریت و اقلیت نہیں، خدا کی کتاب ہے۔ نمائندگانِ امت کو اس کے حدود کے اندر رہتے ہوتے امورِ مملکت سرانجام دینے ہوتے ہیں۔ حق، لوگوں کے خیالات کے تابع نہیں رہ سکتا۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔ (۲۳/۷۱) "اگر حق عوام کی مرضی کے تابع ہو جائے تو زمین اور آسمان میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔" لہٰذا، لوگوں کو حق کے تابع رہنا چاہیئے اور حق قرآن کریم ہی کا دوسرا نام ہے۔

(۵) معیارِ مدارج

معاشرہ میں، مدارج کا تعین، جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی رُو سے ہوگا۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔۔۔ ۔۔۔ (۴۶/۱۹) "ہر ایک کے مدارج ان کی حسنِ کارکردگی کی بنا پر متعین ہونے چاہئیں۔" اور امورِ نظم و نسق ان لوگوں کے سپرد کئے جائیں گے جو انہیں سرانجام دینے کے اہل ہوں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔ (۴/۵۸) "خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ قوم کی امانتیں ان لوگوں کے سپرد کیا کرو جو ان سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہوں۔" جو شخص سیرت و کردار کے اعتبار سے ممتاز ترین ہوگا وہ مملکت کا سربراہ ہوگا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (۴۹/۱۳)۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ یعنی تم میں سے سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو سب سے زیادہ بلند کردار ہوگا۔" چونکہ نظامِ مملکت مشاورتی ہوگا اس لئے ظاہر ہے کہ سربراہِ مملکت بھی امت کے مشورہ سے منتخب ہوگا اور اس وقت تک سربراہ رہے گا جب تک اُسے امت کی تائید حاصل رہے۔

(۶) نظامِ حکومت

حکومت کے انتظامی امور کے لئے ایک مرکز ہوگا اور اس مرکز کے ماتحت افسرانِ مجاز۔ اِس قسم کا نظام سب سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا اس لئے قرآن کریم میں اس کے لئے "خدا و رسول" کی اصطلاح آئی ہے۔ یعنی وہ نظامِ خداوندی جسے رسول اللہ نے متشکل فرمایا۔ "خدا و رسول کی اطاعت" سے مقصود اسی مرکزِ حکومت خداوندی کی اطاعت تھی۔ اس مرکز کے ماتحت، افسرانِ مجاز تھے جنہیں اُولُوا الْاَمْر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اولوالامر کے فیصلوں کے خلاف، مرکز میں اپیل کی جاسکتی تھی لیکن مرکز کا فیصلہ آخری ہوتا تھا۔ سورۃ النسآء میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔ فَاِنْ

تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا - (۵۹)

اے جماعتِ مومنین! یہ ضروری ہے کہ تم اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی پوری پوری اطاعت کرو۔ جسے قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے رسول نے متشکل کیا ہے۔ اور اس مرکز کے مقرر کردہ افسرانِ ماتحت کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان افسرانِ ماتحت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس کے لئے مرکز کی طرف رجوع کرو۔ یعنی تمہیں افسرانِ ماتحت کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کا حق حاصل ہے۔ اگر تم ایسا کروگے تو یہ شہادت ہوگی اس بات کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطۂ ہدایت اور اس کے قانونِ مکافات (حیاتِ آخرت) پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ اور انجام کار معاشرہ میں توازن برقرار رکھنے کا موجب ہوگی۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد یہی نظام آگے چلا اور مرکزی حیثیت خلیفۃ المسلمین کی ہوگئی اور اس کی اطاعت "خدا و رسول کی اطاعت" کے مرادف قرار پاگئی۔ یہ نظام دوبارہ قائم ہوگا تو اس میں مرکزی حیثیت سنٹرل اتھارٹی کو حاصل ہوگی خواہ وہ ایک فرد ہو یا جماعت۔ اس مرکز کی اطاعت بمنزلہ "خدا و رسول کی اطاعت" کے ہوگی۔ امورِ مملکت کے سلسلہ میں پوری ذمہ داری اس سنٹرل اتھارٹی کی ہوگی اور وہ ہر معاملہ میں قرآن کے تابع اور اُمت کے سامنے جوابدہ ہوگی۔

(۷) قولِ فیصل

قرآن کی رُو سے اطاعت، احکامِ خداوندی کی ہے اور اسلامی حکومت ان احکام کی اطاعت کرانے کی ایجنسی ہے۔ اس لئے اگر حکومت کا کوئی فیصلہ خدا کے حکم (قرآن کریم) کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت لازم نہیں آئیگی۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸)۔ خود اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ یعنی "کسی ایسے شخص کی اطاعت مت کرو جس کا دل ہمارے قوانین کی طرف سے غافل ہو چکا ہو۔ وہ اپنے ہی جذبات کے پیچھے لگ چکا ہو اور اس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہو۔" رسول اللہ کے زمانے میں ایسی صورت پیش ہی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن آپؐ کے بعد اس کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس لئے اب ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ اگر افرادِ معاشرہ میں سے کوئی یہ سمجھے کہ حکومت کا فلاں فیصلہ، احکامِ خداوندی کے خلاف ہے تو وہ کسی مقام سے اس کا تصفیہ کرا سکے۔ بہ حالاتِ موجودہ، یہ مقام عدلیہ کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے حکومت کے خلاف

متنازعہ معاملات میں عدالتِ عالیہ کا فیصلہ حرفِ آخر ہونا چاہیئے۔ اور اس سے کسی کو مجالِ سرتابی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس صورت میں عدلیہ کے فیصلہ کو "خدا اور رسول" (مرکزِ نظام) کا فیصلہ تسلیم کرنا چاہیئے جس کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے کہ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (۳۳/۳۶) "جب کسی معاملہ میں خدا اور اس کا رسولؐ (نظامِ خداوندی کی آخری اتھارٹی) کوئی فیصلہ دیدے تو مومن مردوں یا عورتوں کو اس میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ انہیں بطیبِ خاطر اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیئے (۴/۶۵) جو اس کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر بڑے ہی غلط راستے پر جا پڑے گا"!

اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ اس صورت میں اقتدارِ مطلق (SOVEREIGN AUTHORITY) حکومت (یا مقننہ) کو حاصل نہیں ہوگی، عدلیہ کی ہو جائے گی۔ لیکن، جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اسلامی مملکت میں اقتدارِ مطلق، کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے کسی اور کو نہیں۔ نزاعی معاملات میں عدلیہ بھی یہی بتائے گی کہ اس باب میں قرآن مجید کا فیصلہ کیا ہے۔

(۸) پارٹی سسٹم

قرآن کی رُو سے پوری کی پوری امت غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک جماعت (پارٹی) ہے۔ اس (امت) کے اندر پارٹیوں کا وجود، خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں، شرک ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

اے مسلمانو! دیکھنا! تم مومن ہونے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود بھی ایک فرقہ یا پارٹی بن گئے۔ اس صورت میں ہوتا یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک میں مگن رہتا ہے (اور دین ختم ہو جاتا ہے)۔

دوسری جگہ رسول اللہ سے کہا کہ:-

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ - (۶/۱۶۰)

جو لوگ اپنے دین میں فرقے پیدا کرلیں اور خود ایک گروہ یا پارٹی بن کر بیٹھ جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہ سکتا۔ تم ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ وہ ان سے خود نپٹ لے گا اور انھیں بتائے گا کہ تم نے جو کچھ کیا اس کا مآل کیا ہے۔

سورۃ آل عمران میں ہے:۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ - وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ - (۳/۱۰۴)

اے جماعتِ مومنین! دیکھنا! خدا کی طرف سے ایسی واضح تعلیم آجانے کے بعد تم فرقے نہ پیدا کر لینا اور اختلافات میں نہ اُلجھ جانا۔ اگر ایسا کروگے تو تم شدید ترین عذاب میں ماخوذ ہو جاؤ گے۔

ان، اور اسی قسم کی متعدد دیگر آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جب امّت فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جائے تو نہ دین باقی رہتا ہے، نہ اسلامی مملکت وجود میں آسکتی ہے ـــ دین، یا اسلامی مملکت تو نام ہی اس کا ہے کہ ایک ضابطۂ ہدایت (کتاب اللہ)، اس کی حامل ایک امت۔ اور اس مملکت کی ایک مرکزی اتھارٹی۔ اس مملکت میں قرآن کے مرکز کے گرد پوری امّت ایک جماعت کی حیثیت سے مرکوز ہوگی۔ دیکھئے! قرآنِ کریم نے کیسے واضح انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ فرمایا:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا - وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا - كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ - (۳/۱۰۲)

یاد رکھو! دین نہ انفرادی نظریات کا نام ہے نہ گروہ بندیوں کے طریقے کا۔ لہٰذا، تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم، سب کے سب، بلا استثناء اجتماعی طور پر اس نظام کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت راہ دو کہ فرقہ پرستی شرک ہے (۳۰/۳۱-۳۲) اور پارٹی بازی خدا کا عذاب (۶/۶۵)۔ تم ذرا اپنی پچھلی حالت کو یاد کرو جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے اُس حالت میں، تمھیں ایسا نظامِ زندگی عطا کیا جس سے (تم میں صرف ظاہرا

اتحاد ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا اس طرح ایمان کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک برادری بن جانا کتنا بڑا انعام خداوندی تھا۔ تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس (نظامِ خداوندی) نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا۔

اللہ اس طرح اپنے قوانین وضوابط اور ان کے نتائج وثمرات واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا راستہ واضح طور پر تمہارے سامنے رہے۔

قرآنِ مجید نے فرعون کے خلاف سب سے بڑا جرم یہی عائد کیا ہے کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (۲۸/۴)۔ وہ قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔

(۹) مذہبی پیشوائیت

قرآنی نظامِ معاشرہ میں، مذہبی پیشوائیت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں مملکت کے فیصلے قوانینِ شریعت کہلائیں گے اور ان کا نفاذ، عُمّالِ حکومت کے ذریعے ہوگا۔ اسی کا نام "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" ہے۔ یہ احکام زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہوں گے۔ مذہب اور سیاست یا دین اور دنیا میں تفریق یکسر غیر اسلامی تصور ہے اور پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز، سیکولر نظام کی تخلیق۔ قرآنی احکام واقدار زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوں گے، خواہ وہ پرسنل (شخصی) ہوں اور خواہ پبلک (اجتماعی)۔ ان احکام کی تعلیم، حکومت کے زیرِ اہتمام سکولوں اور کالجوں میں ہوگی اور انہی پر مشتمل لٹریچر، عوام میں شائع کیا جائے گا۔ اس لئے اسلامی مملکت میں مذہبی مکتبوں یا دار العلوموں کا الگ وجود نہیں ہوگا۔ نہ ہی "علماء" کا کوئی جداگانہ گروہ۔

(۱۰) اسلامی مملکت کے عناصرِ ترکیبی

خدا کی کتاب، میزانِ عدل اور قوتِ نافذہ۔ یہ ہیں اسلامی حکومت کے عناصرِ ترکیبی یا اقنومِ ثلاثہ۔ ان میں سے ایک کی بھی کمی ہو جائے تو وہ مملکت اسلامی نہیں رہتی۔ سورۃ الحدید میں دین کا اساسی مقصد ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ

يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ (۲۵/۵۷)

اس مقصد کے لئے خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ مختلف اقوام کی طرف، اپنے رسولوں کو، واضح دلائل دیکر بھیجتا ہے اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی لاتا ہے۔ وہ، اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں ہر شخص کا عمل، ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اس معاشرہ کے استحکام کے لئے اس نے ضابطۂ قوانین کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے جس میں بڑی سختی ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ سختی عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اس لئے۔ یہ نوعِ انسان کے لئے مضرت رساں ہونے کے بجائے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ کون سے وفا شعار بندے ہیں جو اس نظامِ خداوندی کی مدد کرتے ہیں جو اس کے رسولوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے، حالانکہ اس کے درخشندہ نتائج ہنوز، مرئی شکل میں، ان کے سامنے نہیں آئے ہوتے اور وہ اپنے یقینِ محکم کی بنا پر اس کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یوں خدا کا وہ نظام، جو اپنے اندر غلبہ اور قوت رکھتا ہے، ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

اور سورۃ النّور میں، اسلامی مملکت (خلافت) کی غرض و غایت کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۔ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (۲۴/۵۵)

ہم نے ان لوگوں سے جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انھیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (۲۱/۱۰۵)۔ (اور ان کی حکومت، اس خطۂ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی۔ ۳۹/۷۴) ـــ یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن فی الارض) عطا کی تھی (۶/۶)۔ اسی قانون کے مطابق ہم ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں انہیں حکومت عطا کر دیں گے اور ان کے اس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دیں گے جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف، امن سے بدل جائیگا، تاکہ وہ نہایت اطمینان سے، ہمارے اور صرف ہمارے، قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا

وبا ؔ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور کی بھی اطاعت کریں، اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں (دنیا کی کوئی طاقت انھیں مجبور نہ کر سکے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کریں)۔

(لیکن اسے اچھی طرح سن رکھو کہ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی) جو لوگ ایسا نظام قائم ہوجانے کے بعد، اس سے عملاً انکار کر دیں گے (اور احکامِ خداوندی کے بجائے اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں گے) تو یہ لوگ، اس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر جو انھیں صحیح منزل کی طرف لئے جا رہی تھی، اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے (اور اس لئے، اس جنتی معاشرہ کی برکتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ برکات ایمان و عمل کا نتیجہ تھیں، جب ایمان و عمل نہ رہا تو وہ برکات کیسے باقی رہیں گی؟)

لیکن اسلامی مملکت کا فریضہ صرف قانون کا نفاذ ہی نہیں، افرادِ معاشرہ میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا بھی ہے جس سے ان کے دل میں اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تڑپ اور قانون کا احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مقصد صحیح نظامِ تعلیم و تربیت اور اربابِ حل و عقد کے ذاتی کیریکٹر کے نمونے سے حاصل ہوگا۔ جب تک کسی قوم کی نفسیات میں اس قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اس قوم کی حالت بدل نہیں سکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱)۔ "خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرلے"۔ قرآن کی بیان کردہ ابدی حقیقت ہے۔

(۱۱) غیر مسلموں کی پوزیشن

اس مملکت میں غیر مسلموں کو (انسان ہونے کی جہت سے) حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے۔ انہیں پوری پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ مذہبی آزادی کے متعلق لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ (۲/۲۵۶)۔ "دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ جائز نہیں"۔ اس کا بنیادی آئین ہے۔ اس کا عالمگیر منشور یہ ہے کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ..... (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہہ دو۔ اعلان کر دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ لیکن چونکہ اس مملکت کا وجود، نظامِ خداوندی کے قیام اور قرآنی قوانین کے نفاذ کے لئے عمل میں آتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں (یعنی غیر مسلم) انہیں امورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ غیر مسلموں کو اپنا رازدار مت بناؤ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (۳/۱۱۷)۔

انسانوں کی تقسیم، خون، رنگ، زبان، وطن، قومیت کے بجائے، آئیڈیالوجی (ایمان) کی بنا پر ہوگی۔ جو لوگ وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار پر ایمان رکھیں اور نظامِ خداوندی کے قیام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں، وہ ایک جماعت کے افراد۔ ان کے برعکس، جو لوگ، ان اقدار سے انکار کر کے، اپنے لئے کوئی اور نظام تجویز کریں، وہ دوسری جماعت کے افراد ــــ چونکہ وحدت اور یگانگت کے لئے نصب العین کا اشتراک بنیادی شرط ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ ان دو متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والوں میں قلبی تعلقات کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

لہٰذا اے جماعتِ مومنین! تم اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا کسی کو اپنا رازدار نہ بنانا۔ یہ (دوسرے) لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو جاؤ جن سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر بے اختیار آ جاتی ہیں۔ لیکن، جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے' وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم نے یہ باتیں اس لئے واضح طور پر بیان کر دی ہیں کہ تم عقل و ہوش سے کام لے کر' ان کی طرف سے محتاط رہو۔

اس سے آگے ہے :۔

هٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۔ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۔ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ (۳/۱۱۸)

دیکھو! ایسا کبھی نہ کرنا کہ تم انھیں اپنا دوست بنا لو۔ اگر تم ایسا کرو گے بھی، تو وہ تمھیں کبھی اپنا دوست نہیں بنائیں گے، حالانکہ تم' ان تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی تھیں، اور ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو ان (تمھارے مخالفین) کے انبیاء کی طرف نازل ہوتی تھیں۔ تم یہ کچھ خلوصِ قلب سے کرتے ہو، لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (قرآن پر) ایمان رکھتے ہیں۔

اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو شدتِ عداوت سے، تمہارے خلاف، غصہ میں، اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ! اپنے غصے میں مرمٹو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے ہو اور تمہارے سینے میں کیا چھپا ہوا ہے۔ تمہاری نفسیاتی کشمکش اور دورُخی زندگی تمھارے لئے سامانِ ہلاکت بن جائے گی۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:-

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْــًٔا ۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۔ (۳/۱۱۹)

ان کے خبثِ باطن کا یہ حال ہے کہ، اگر کوئی اچھی بات تمہیں چھو کر بھی گزر جاتے تو انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن تم ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ اگر تم اپنے پروگرام میں ثابت قدم رہے اور قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرتے رہے تو ان کی تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اللہ کا قانونِ مکافات انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوتے ہے۔ اس لئے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوں گے، نہ کہ ان کی خواہشات کے مطابق۔

چونکہ اصل معاملہ آئیڈیالوجی (دین) کا ہے اس لئے اس باب میں رشتہ داروں تک میں بھی استثناء نہیں کیا گیا۔ فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۹/۲۳)

اے ایمان والو! (اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سے سمجھ لو کہ آئینِ خداوندی کی رو سے، اپنوں اور بیگانوں کی تفریق نسلوں اور خاندانی رشتوں کی بنا پر نہیں ہوگی، بلکہ نظریۂ زندگی کے اشتراک کی رو سے ہوگی۔ لہٰذا) اور تو اور، اگر، تمہارے باپ اور بھائی بھی، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کریں تو تم انہیں اپنا دوست مت بناؤ۔ یاد رکھو! اس تنبیہہ کے بعد بھی جو انھیں دوست رکھے گا تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا یہ قانونِ خداوندی سے سرکشی کے مرادف ہوگا۔

اس کی اہمیت کس قدر ہے، اس کے متعلق کہا۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ

اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ۔ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۔ (۹/۲۴)

(اے رسول!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہلِ خاندان، اور مال و دولت جو تم کمانے ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنھیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمھیں خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) اور اس کے قیام و بقا کی راہ میں جد و جہد سے زیادہ عزیز ہے تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تاآنکہ قانونِ خداوندی کی رو سے، اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر، اِدھر اُدھر نکل جائے۔

قرآن کریم نے دو عظیم ہستیوں کی زندگی کو بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) کہہ کر پیش کیا ہے۔ ایک حضور نبی اکرمؐ اور دوسرے حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ کی سیرت و کردار کی کون سی نمایاں خصوصیت تھی جسے بطور اسوہ پیش کیا گیا۔ اس کے متعلق فرمایا:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ (۶۰/۴)

یہ بات سمجھنے کے لئے (کہ دینِ خداوندی کے مقابلہ میں رشتہ داری کے تعلقات کی حیثیت کیا رہ جایا کرتی ہے) تمہارے لئے ابراہیمؑ، اور اس کے رفقاء کا طرزِ عمل، نہایت عمدہ نمونہ ہے جو تمہارے دلوں کی کشمکش دور کر کے، ان میں سکون اور اطمینان پیدا کر دے گا۔ (۶۰/۶)۔ انہوں نے اپنی قوم سے (جن سے ان کے خون کے رشتے تھے) علانیہ کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کی تم نے، خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے ان سے، سخت بیزار ہیں (۴۳/۲۶-۲۷)۔ ہم تمہارے غلط مسلک کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر تم میں اور ہم میں، ہمیشہ کے لئے دشمنی اور عداوت رہے گی تاآنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ (اس صورت میں تم ہمارے دینی بھائی بن جاؤ گے ۹/۱۱؛ ۴۹/۱۰)۔

قرآن کریم میں اس مضمون کی متعدد آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ تم غیر مسلموں کو اپنا راز دار نہیں بنا سکتے۔ اس سے واضح ہے کہ انھیں شریکِ امورِ مملکت کرنا تو ایک طرف انھیں کلیدی اسامیوں پر بھی تعینات نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انھیں انسانی حقوق سے محروم کر دیا جاتے گا۔ بالکل نہیں۔ ان سے عدل کیا جائے گا۔ اس باب میں تو قرآن اس حد تک آگے جاتا ہے کہ کسی دوسرے نظام میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۔ اِعْدِلُوْا ۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5/8)

کوئی قوم اگر تم سے دشمنی کرتی ہے تو یہ بات تمھیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ اس کی طرف سے دشمنی کے باوجود اس کے ساتھ عدل کرو۔ یہ چیز تمھیں اس معیارِ زندگی کے قریب تر لے آئے گی جس تک تمھیں خدا پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ جادۂ عدل پر گامزن رہو۔

ان سے عدل ہی نہیں بلکہ حسنِ سلوک کیا جائے گا۔ سورۃ الممتحنہ میں واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ خدا تمھیں ان دشمنانِ دین کے ساتھ دوستداری کے تعلقات استوار کرنے سے منع کرتا ہے ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے منع نہیں کرتا۔ (دیکھئے 60/8)۔ وہ تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوگا کہ غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کرے۔ وہ کہتا ہے کہ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ (22/40)۔ "اگر خدا ایسا انتظام نہ کرتا کہ اگر کوئی قوم ظلم واستبداد پر اُتر آئے تو کوئی اور قوم ان کی روک تھام کرے تو دنیا میں کسی مذہب کی پرستش گاہ بھی محفوظ نہ رہتی۔ رھبان کی خلوت گاہیں اور یہودیوں کے ہیکل، عیسائیوں کے گرجے، مسلمانوں کی مسجدیں، سب ڈھے چکی ہوتیں"۔ ان کی حفاظت کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ..... (6/109)۔ "تم غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔ ایسا کروگے تو وہ بربنائے جہالت، تمھارے معبود (اللہ) کی شان میں گستاخی سے پیش آئینگے۔ اس سے فساد برپا ہوگا۔ لہٰذا، تم ان کے بزرگوں کے ساتھ گستاخی سے پیش نہ آؤ"۔

یہ ہوگی پوزیشن غیر مسلموں کی، اسلامی مملکت میں۔

مملکتِ اسلامی کے باشندے ہونے کی بنا پر کس حد تک ان پر اسلامی قوانین نافذ ہوں گے اور کن (شخصی) امور میں انہیں اپنے فیصلے آپ کرنے کی اجازت ہوگی، اس کا فیصلہ اسلامی مملکت کا آئین کرے گا۔

۱۲- بین الاقوامی تعلقات

قرآن کا منتہیٰ، تمام نوعِ انسانی کے اختلافات مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ (۲/۲۱۳)۔ اور سورۂ یونس میں اس کے بعد کہا گیا ہے ۔ فَاخْتَلَفُوْا ۔ (۱۰/۱۹)۔ ان آیات میں کہا یہ گیا ہے کہ نوعِ انسان ابتداءً ایک امت (ایک برادری) تھی ۔ اس کے بعد انھوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے ۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ (۲/۲۱۳)۔ سو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بھیجنا شروع کیا اور ان کے ساتھ ضوابطِ قانون تاکہ وہ ان کے ذریعے لوگوں کے اختلافات مٹا کر انھیں پھر امتِ واحدہ بنا دیں "

کسی ایک خطۂ زمین میں اسلامی مملکت کا قیام اس مقصد کے لئے تجربہ گاہ کا کام دیتا ہے ۔ اس سلسلہ میں یہ مملکت دیگر اقوامِ عالم سے ان امور میں تعاون کریگی جو عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت کا موجب ہوں، اور ان امور سے عدم تعاون اختیار کرے گی جو انوعِ انسانی کے لئے موجبِ تخریب ہوں ۔ جماعتِ مومنین سے کہا گیا ۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔ (۵/۲)"ان تمام امور میں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کی راہیں کشادہ کریں اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا موجب بنیں، تعاون کرو ۔ اور جو امور انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا موجب ہوں یا خدا کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کا باعث، ان میں کبھی تعاون نہ کرو " اس نے یہ عالمگیر اصول بتایا کہ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)۔ یاد رکھو! دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت کا موجب ہو" یہی اصول اس کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہوگا ۔ دنیا سے فساد مٹانا اور امن قائم رکھنا اس کے مملکتی مقاصد میں شامل ہوگا ۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔ (۲/۶۰)۔" دنیا میں فساد مت پھیلاتے پھرو" اس کا تاکیدی حکم ہے ۔ اور احترامِ آدمیت کا فروغ اس کی ہستی کے لئے وجہِ جواز ۔ اس لئے کہ اس کا اصولِ اساسی یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ (۱۷/۷۰)۔ ہم نے تمام بنی آدم کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے"

چونکہ یہ مملکت ان بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ اپنی آزادی کو برقرار رکھے ۔ اس کے لئے اس کی سرحدات کی حفاظت نہایت ضروری ہے ۔ اس مملکت سے اس کا تاکیدی حکم ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۔ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۔ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۔ (۸/۶۰)۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں کے ذریعے مستحکم رکھو تاکہ تم اس سے ان معاند قوتوں کو خائف رکھ سکو جو تمہاری ذات کی بھی دشمن ہوں اور نظامِ خداوندی کی بھی دشمن ۔ اور ان کے علاوہ انھی جیسے دیگر دشمنوں کو بھی جن کا ابھی تمھیں علم نہیں ۔ اللہ کو ان کا علم ہے ۔" ان قوتوں کے خلاف عندالضرورت جنگ بھی کرنی پڑے گی " (چونکہ " اسلام میں جنگ " ایک الگ موضوع ہے اس لئے اس کی تفاصیل اس مقام پر نہیں دی گئیں[1])

(۱۳) معاہدات

قیامِ امن اور تحفظِ حقوقِ انسانیت کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ معاہدات بھی کئے جائیں گے۔ ان معاہدات کا احترام نہایت ضروری ہے۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ (۵/۱) "اپنے معاہدات کو پورا کرو" اس کا تاکیدی حکم ہے۔

(۲) جب کسی معاہد قوم کی طرف سے خیانت کا خدشہ ہو تو اس کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ اسے واپس لوٹا دینا چاہیئے۔ سورۃ انفال میں ہے۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔ (۸/۵۸)۔ "اگر تمہیں کسی پارٹی (یا قوم) کی طرف سے عہد شکنی کا اندیشہ ہو تو تم انہیں اطلاع دیئے بغیر یونہی معاہدہ نہ توڑ ڈالو، بلکہ انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو اور اس طرح دونوں ایک سطح پر آجاؤ اور اگر اس طرح قبل از وقت معاہدہ ختم کرنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچا ہو تو اس کی تلافی کر کے ان سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے بدعہدی کو کبھی پسند نہیں کیا جا سکتا" معاہدہ کی تجدید منظور نہ ہو تو اس کے متعلق بھی اس طرح پہلے سے اعلان کرنا چاہیئے کہ متاثر لوگ اپنا ضروری انتظام کر سکیں۔ فتح مکہ کے بعد، مخالفین کے ساتھ یہی انداز اختیار کیا گیا تھا۔ سورۃ توبہ کی ابتدائی چار آیات (۹/۱-۴) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن جو لوگ یونہی معاہدہ توڑ دیں ان کے خلاف جنگ کی جا سکے گی۔ اسی سورۃ کی آیات (۹/۱۲-۱۳) میں اس کا ذکر آیا ہے۔

(۳) اگر دشمن اس قوم کے ساتھ جا ملے جس سے تمہارا معاہدہ ہے تو اس کے خلاف جنگ روک دی جائے گی۔ نیز ان لوگوں کے خلاف بھی جنگ نہیں کی جائے گی جو غیر جانبدار رہنا چاہیں۔ آیت (۴/۹۰) میں اس کی تفصیل دی گئی ہے۔

(۴) معاہد قوم کے خلاف مسلمانوں کی بھی مدد نہیں کی جا سکتی۔ (۸/۷۲)

(ان امور کے متعلق تفصیلی احکام بھی جنگ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس مقام پر صرف چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے)

(۱۴) بغاوت

اس قسم کی اسلامی مملکت میں فساد پھیلانا (انتشار پیدا کرنا۔ نقضِ امن کرنا۔ لاقانونیت پھیلانا)۔ یا اس کے خلاف بغاوت کرنا سنگین جرم ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے۔ سورۃ مائدہ میں ہے:-

اِنَّمَا جَزَآؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ

يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۔ ذٰلِكَ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ (۵/۳۳)

ان کی اسی مفسدانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اب جب کہ اس ملک میں نظامِ عدل و احسان قائم ہو چکا ہے جس میں انھیں ہر طرح کا امن و آرام حاصل ہے، بجائے اس کے کہ یہ اطمینان سے بیٹھیں یہ بدستور تخریبی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ ایسا کرنا عدل و آئین پر مبنی نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت ہے۔ اس باب میں ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اس نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت کریں، ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا مخالف سمت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں[۱]۔ یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے (یا نظر بند کر دیا جائے اور عام مراعات سے محروم کر دیا جائے) ــــ غرضیکہ جرم کی نوعیت، اور ملک کے حالات کے پیشِ نظر جو سزا مناسب سمجھی جائے دی جائے۔ یہ سزا، ان کے لئے دنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہو گی۔ باقی رہی آخرت، سو وہاں بھی ان کے لئے سخت تباہی ہو گی ــــ اس لئے کہ اس جرم کا ایک اثر تو سوسائٹی کے نظام پر پڑتا ہے جس کی روک تھام کے لئے سزا ضروری ہے اور دوسرا اثر خود مجرم کی اپنی ذات پر پڑتا ہے (۴/۱۱۱) اس کا نتیجہ اس ذات کا ضعف و انتشار ہے جو حیاتِ اخروی میں تباہی کا موجب ہے۔

لیکن اگر یہ لوگ مغلوب ہونے سے پہلے، ہتھیار رکھ دیں (توبہ کر لیں) تو ان سے مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ مندرجہ بالا آیت سے ملحق آیت میں ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۵/۳۴)

لیکن، لوگ اس روش سے از خود باز آ جائیں، قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پا لو، تو اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے ایسے لوگ سزا سے بھی محفوظ رکھے جا سکتے ہیں۔ اور انھیں عام سہولتوں سے بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں بھی، نظامِ اسلامی کے خلاف جنگ کرنے والوں کا ذکر آیا ہے (دیکھئے ۹/۱۲ ، ۲۰/۱ ، ۵۸/۵)

اس نظام کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف، اس قسم کے لوگوں کے ساتھ تعلقات وابستہ رکھنا بھی جرم ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ

---

[۱] اس کے معنی الٹی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ڈال دینا بھی ہو سکتے ہیں۔

كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۔ (۵۸/۲۲)

(جب حقیقت یہ ہے کہ حق اور باطل ایک دوسرے کی ضد اور باہم متخالف ہیں، تو) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ خدا کے قانون اور مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھیں وہ ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کریں جو نظامِ خداوندی کے مخالف ہوں، خواہ وہ ان کے (ماں) باپ، یا بیٹے (بیٹیاں) یا بھائی (بہن) یا ان کے خاندان کے دوسرے افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ (۳/۱۱۷ ؛ ۹/۲۴)

(۲) اسلامی حکومت کے خلاف خیانت کرنا بھی جرم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۸/۲۷)

اے جماعتِ مومنین! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم، نہ تو اس نظامِ خداوندی (خدا و رسول) سے کسی قسم کی خیانت کرو اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔

اور خیانت کرنے والوں کی وکالت کرنا بھی جرم ۔ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۔ (۴/۱۰۵ ؛ ۴/۱۰۷) "ایسا کبھی نہ کرو کہ خیانت کرنے والوں کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو"۔ اسی طرح سازشیں کرنا یا خلافِ قانون امور میں خفیہ مشورے کرنا بھی جرم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۔ (۵۸/۹)

اے جماعتِ مومنین! جب تم نے باہمی مشورے کرنے ہوں تو جرائم کے ارتکاب اور نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی کے مشورے مت کرو۔ ہمیشہ بھلائی اور تقویٰ (قوانینِ خداوندی کی نگہداشت) سے متعلق امور میں مشورے کرو۔

اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ان امور کو مناسب شکل میں، مملکت کے آئین میں درج کرے تاکہ ان کی حیثیت آئینی ہو جائے۔

عمّالِ حکومت

سرکاری ملازمین کے لئے ہدایات

(۲)

یوں تو اسلامی مملکت کے ہر قانون اور ضابطہ کا، عمّالِ حکومت پر بھی دیگر افرادِ معاشرہ کی طرح یکساں طور پر اطلاق ہوگا لیکن ان کی خصوصی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر، بعض امور میں انہیں خاص احتیاط برتنی پڑے گی۔ مثلاً:-

(۱) خدا کا قانونِ مکافات، انسان کے ظاہرا اعمال ہی پر نہیں بلکہ اُس کے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک سے بھی واقف ہوتا ہے، اس لئے اگر وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کسی قسم کا تساہل، تغافل، غیر ذمہ داری یا خیانت کا ارتکاب کریں، اور کسی نہ کسی طرح ملک کے قانون کی گرفت سے بچ بھی جائیں تو انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وہ خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے کسی صورت میں بچ نہیں سکتے۔ خدا (کے قانونِ مکافات) کی تو کیفیت یہ ہے کہ یَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہ کی خیانتوں اور دل میں چھپے ہوئے ارادوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔

(۲) انہیں ہر معاملہ میں دیکھنا ہوگا کہ ان کا کوئی فیصلہ قرآنی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا بنیادی فریضہ ہے۔ (۲۲/۴۱)۔ ان کا فیصلہ نہ صرف عدل کے تقاضوں کو پورا کرے بلکہ احسان کے تقاضوں کو بھی۔ ان کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے کہ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴/۵۸) "تم جب بھی لوگوں کے نزاعی معاملات کا فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کے مطابق کرو"۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ

یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (۱۶/۹۰) "اللہ تمھیں عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے" عدل تو یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب ہے اسے وہ دلا دیا جائے۔ اور احسان یہ ہے کہ اس کی کمی پوری کرکے، اس کے توازن کو برقرار رکھا جائے "عدل اور احسان" قرآن کریم کی دو بنیادی اصطلاحات ہیں جن کا عملی مفہوم، روزمرہ کے معاملات پر غور و فکر سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ (مثلاً) چور کو قانون کے مطابق سزا دے دی گئی۔ یہ تو اس کے ساتھ عدل ہوا۔ لیکن جس کا مال چوری ہوگیا ہے، اس سے اس کے نقصان کی تلافی تو نہیں ہوئی۔ عدل و احسان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی کمی بھی پوری کی جائے۔

(۳) جو کچھ وہ دوسروں سے کہیں اس پر خود بھی عمل کرکے دکھائیں۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ (۶۱/۲-۳)

اے جماعتِ مومنین! تم اپنے دعوئے ایمان کا ثبوت اپنے عمل سے پیش کرو۔ ایسا کبھی نہ کرو کہ، زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے رہو اور انہیں عملاً پورا کرکے نہ دکھاؤ۔ جو کچھ زبان سے کہو اسے عمل سے پورا کرکے دکھاؤ۔ قول و فعل میں ہم آہنگی، دعوئے ایمان کی صداقت کا ثبوت ہے۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے یہ بات بڑی مذموم اور قابلِ گرفت ہے کہ ایسی باتیں کی جائیں جنہیں کرکے نہ دکھایا جائے۔

(۴) مملکت کی ہر شے (حتیٰ کہ اس کا ہر راز) ان کے پاس امانت ہے۔ ان امانات میں خیانت نہ کریں۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۸/۲۷)

اے جماعتِ مومنین! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم، نہ تو اس نظامِ خداوندی (خدا اور رسول) سے کسی قسم کی خیانت کرو اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں جو تمھارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔

(۵) ہر حقدار تک اس کا حق پہنچائیں۔ اور حکومت کی اسامیاں ان لوگوں سے پُر کریں جو اُن کے ہر لحاظ سے اہل ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا۔ (۴/۵۸)۔ میں یہ دونوں مفہوم آجاتے ہیں۔

(۶) اپنے اعتماد کو کبھی نہ توڑیں۔ سورۂ بقرہ کی اس آیت ــ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ۔ (۲/۲۸۳)۔ کا بنیادی طور پر تعلق تو اشیائے مرہونہ سے ہے لیکن بطور اصول اس کا اطلاق ہر قسم کے اعتماد پر ہوسکتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جو کچھ بھی تم پر اعتماد کرکے تمہارے سپرد کیا جائے، تم اپنے اس

اعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دو۔

(۷) کسی قسم کی سازش میں حصہ نہ لیں۔ اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں کہ لَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ۔ (۳۵/۴۳) "تخریبی تدبیریں یا سازشیں خود ان سازش کرنے والوں کی طرف پلٹ کر آجایا کرتی ہیں"

(۸) اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ (۵/۲) ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ یعنی امورِ خیر میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور حق و صداقت جہاں بھی ہو اس کا ساتھ دو۔ كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔ (۹/۱۱۹)۔ خدا کا تاکیدی حکم ہے۔ یعنی صداقت شعاروں کے ساتھ ہو جاؤ۔

(۹) اگر وہ دیکھے کہ کوئی دوسرا افسر، صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے غلط فیصلہ دے رہا ہے تو اس تک صحیح معلومات پہنچا دے۔ اسے "شفاعتِ حسنہ" کہا جائے گا۔ غلط بات کی سفارش کسی سے نہ کرے۔ سورۃ النساء میں ہے:

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا۔ (۴/۸۵)

جو شخص عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی کے ساتھ کھڑا ہو جائے گا (اسے شفاعتِ حسنہ کہتے ہیں)، تو اسے بھی اس کے خوشگوار نتائج سے حصہ مل جائے گا۔ اس کے برعکس، جو شخص ظلم اور ناانصافی کی تائید کرے گا (اسے شفاعتِ سیئہ کہہ کر پکارا گیا ہے)، تو اس کے تباہ کن عواقب میں وہ بھی شریک ہوگا۔

نہ ہی کسی بددیانت، خائن کی طرف داری کرے۔ لَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا۔ (۴/۱۰۵) ارشادِ خداوندی ہے۔ یعنی کسی خائن کی حمایت اور وکالت کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہو۔ نہ ہی کبھی رشوت قبول کرو۔ سورۃ بقرہ کی حسبِ ذیل آیت بڑی جامع ہے:۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (۲/۱۸۸)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر نہ کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک جا پہنچے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے، اس کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں!

(۱۰) ہر متنازعہ معاملہ کی خود تحقیق کر لیا کریں۔ سنی سنائی باتوں پر بھروسہ نہ کریں۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ

كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶)۔

یاد رکھو! جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو (یعنی جس کی خود تحقیق نہ کر لو)، اس کے پیچھے مت لگو۔ (ذاتی تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ، تم اپنی سماعت و بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو۔ اور پھر ان معلومات کی بنا پر فیصلہ کرو، اور اس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچو۔ ان میں سے اگر ایک کڑی بھی گم ہو گئی تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائے گی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے (اس لئے کہ خدا نے تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے، مجبور مشین نہیں بنایا۔ اور اس اختیار کے استعمال کے لئے، ذرائع علم و تحقیق عطا کر دیئے ہیں۔ ان سے کام نہ لینے والا اپنی ذمہ داری سے جی چراتا ہے۔

(۱۱) برائی کی روک تھام اپنے حسنِ عمل سے کریں۔ اصول یہ ہے کہ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ (۲۳/۹۶) برائی کی مدافعت بھلائی سے کرو۔

(۱۲) جس سے کوئی غلطی نادانستہ سرزد ہو جائے اور اس میں اصلاح کا امکان ہو، اسے معاف کر دیا جائے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶/۵۴)۔ اگر تم میں سے کسی سے کوئی بھول چوک ہو جائے اور اس کے بعد وہ اپنے کئے پر نادم ہو اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لے تو اسے نظامِ مملکت کی طرف سے حفاظت اور مرحمت عطا ہو جانی چاہیئے۔" اور اگر کسی جرم کی سزا مقتضائے عدل ہو تو، وہ سزا جرم سے زیادہ نہ ہو۔ اس باب میں اصول یہ ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۴۲/۴۰)، "جرم کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔"

(۱۳) اپنے آپ پر ضبط رکھا جائے۔ یونہی غصہ میں نہ آ جائیں۔ اَلْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ۔ (۳/۱۳۳)۔ مومنین کا شعار بتایا گیا ہے "غصے میں آپے سے باہر نہ ہو جانا اور بھولے بھٹکے غلطی کر جانے والوں سے درگزر کرنا۔" ضبطِ خویش کے ضمن میں یہ بھی آ جاتا ہے کہ بات آہستہ اور نرمی سے کی جائے۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (۳۱/۱۹) اور وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ۔ (۳۱/۱۹)۔ گفتار میں نرمی اور رفتار میں میانہ روی، ثقاہت اور سنجیدگی کی علامات ہیں۔ بحث و تمحیص کی صورت میں، دوسروں سے اپنی افسری کے رعب سے بات منوانے کی کوشش نہ کریں بلکہ ان سے بطریقِ احسن بات کریں۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ (۱۶/۱۲۵)۔

(۱۴) وعدہ ہمیشہ پورا کریں۔ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۴)۔ اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ یاد رکھو! ان کی بابت تم خدا کے ہاں جواب دِہ ہو گے۔

(۱۵) اپنی ذمہ داری دوسرے پر نہ ڈالیں۔ اصول یہ ہے کہ۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (۵۳/۳۸)۔
کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"ہر ایک اپنا بوجھ خود اٹھائے گا۔

(۱۶) یہ کبھی نہ چاہیں کہ لوگ ان کی، اُن کاموں کی وجہ سے تعریف کریں، جنھیں وہ کرکے نہیں دکھاتے۔ خوشامدی یہی کچھ کرتے ہیں۔ اس لئے وہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن ہوتے ہیں۔ منافقین کا شیوہ یہ بتایا گیا ہے کہ:-

یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا۔ (۳/۱۸۷)۔

وہ چاہتے یہ ہیں کہ لوگ ان کی ان کاموں کی بنا پر تعریف کریں جنھیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔

(۳)

اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ ملک میں عدل قائم کرے۔ عدل کا تقاضا تو زندگی کے ہر شعبہ میں ہوتا ہے لیکن اس جگہ ہم صرف عدالتی عدل کے متعلق بات کریں گے جس کا تعلق قانون سے ہے۔ قرآن، عدل کرنے والی ایجنسی (یعنی عدالت) کے لئے بھی ضروری راہ نمائی دیتا ہے۔ عدل کے سلسلہ میں ایک اہم بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ دنیا کے عام تصور کے مطابق، عدالت کا منصب ملک کے مروّجہ قوانین کے مطابق متنازع معاملات کے فیصلے کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی فیصلہ مروّجہ قانون کے مطابق ہوگا تو اسے مبنی بر عدل کہا جائے گا لیکن ذرا سوچئے کہ اگر خود وہ قانون ہی "عدل" پر مبنی نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ مبنی بر عدل کس طرح قرار پائے گا؟ لہٰذا قرآنِ کریم بنیادی طور پر یہ کہتا ہے کہ ملک کا قانون بھی عدل پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اس باب میں وہ اس فلسفیانہ بحث میں نہیں الجھتا کہ قانون کے مبنی بر عدل ہونے سے مفہوم کیا ہے اور عدل کی تعریف کیا۔ اس کا خطاب اسلامی مملکت سے ہے۔ اس لئے وہ مختصر الفاظ میں یہ دو ٹوک فیصلہ سنا دیتا ہے۔

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو انہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے۔

یعنی اگر حکومت کا قانون کتاب اللہ کے مطابق ہے تو وہ اسلامی مملکت ہے۔ اگر اس کے مطابق نہیں تو وہ کافرانہ حکومت ہے۔ جو قانون کتاب اللہ کے مطابق ہوگا وہ مبنی بر حق قرار پائے گا جو اس کے خلاف ہوگا وہ ظلم پر مبنی ہوگا۔ اسی لئے اس نے "عدل کرنے والوں" کے متعلق کہا ہے يَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۷/۱۵۹) وہ حق کی طرف لوگوں کی راہ نمائی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔ الحق کے مطابق عدل ہی درحقیقت عدل ہے۔

اگر قانون ہی الحق کے مطابق نہیں تو اس قانون کے مطابق عدل، حق کے مطابق قرار نہیں پا سکتا۔ اور الحق کتاب اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہی فرق ایک اسلامی حکومت اور سیکولر حکومت میں ہے۔ سورۂ صٓ میں ہے۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ۔ اے داؤد! ہم نے تمھیں ملک میں حکمرانی عطا کی ہے۔ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ تم لوگوں کے متنازع امور کے فیصلے حق کے ساتھ کرو۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى۔ اور اس میں اپنے جذبات کو قطعاً دخل نہ دینے دو۔ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۳۸/۲۶)۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ بات تمھیں خدا کی راہ سے گمراہ کر دے گی۔" اس سے دو باتیں واضح ہیں، ایک یہ کہ ملک کا قانون الحق (کتاب اللہ) کے مطابق ہونا چاہیئے، اور دوسرے یہ کہ عدالت کو اپنے جذبات سے بلند ہو کر، قانون کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اسی کو "عدل کے مطابق فیصلہ" کہا جائے گا۔

(۲) نظامِ عدل کے لئے قرآن کا حکم یہ ہے کہ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (۴/۵۸) "جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو فیصلہ عدل کے مطابق کرو۔" مصالحت بھی عدل کے ساتھ کراؤ۔ سورۂ حجرات میں ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ۔ (۴۹/۹) "تو ان میں عدل (کتاب اللہ) کی رُو سے مصالحت کرا دو۔"

(۳) کسی قوم کی دشمنی بھی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے کام نہ لو۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (۵/۸)۔ کسی قوم کی دشمنی بھی تمھیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی شعار تقویٰ کے قریب تر ہے۔

(۴) مسلمانوں ہی کے نہیں غیر مسلموں کے فیصلے بھی عدل کیساتھ کرو۔ رسول اللہؐ سے ارشاد ہے کہ اگر اہلِ کتاب بھی تمہارے پاس فیصلوں کے لئے آئیں تو فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (۵/۴۲) تو ان کے باہمی فیصلے بھی انصاف کی رُو سے کرو۔

(۵) رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ سو تم لوگوں کے فیصلے اس کتاب کے مطابق کرو اور ان کے جذبات اور خواہشوں کے پیچھے مت چلو۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ۔ (۵/۴۸)۔

(۶) الکتاب (ضابطۂ قوانینِ خداوندی)۔ اس ضابطۂ قانون کو نافذ کرنے کے لئے قوت (حکومت) اور میزانِ عدل۔ یہ ہیں اسلامی حکومت کے بنیادی عناصر۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے۔ سورۂ حدید میں ان گوشوں کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ (۵۷/۲۵)

اس مقصد کے لئے خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ، مختلف اقوام کی طرف، اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجتا ہے اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطہ قوانین بھی لاتا ہے۔ وہ اس ضابطہ قوانین کی رو سے ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں ہر شخص کا عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اس معاشرہ کے استحکام کے لئے اس نے ضابطہ قوانین کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے۔ جس میں بڑی سختی ہوتی ہے اور چونکہ یہ سختی عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اس لئے یہ نوع انسان کے لئے مضرت رساں ہونے کے بجائے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے وفا شعار بندے ہیں جو اس نظام خداوندی کی مدد کرتے ہیں جو اس کے رسولوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے، حالانکہ اس کے درخشندہ نتائج ہنوز، مرئی شکل میں، ان کے سامنے نہیں آتے ہوتے، اور وہ اپنے یقین محکم کی بنا پر اس کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یوں خدا کا وہ نظام جو اپنے اندر غلبہ اور قوت رکھتا ہے، ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

(۷) عدل کرنے میں اپنوں اور بیگانوں میں کوئی تمیز نہ کرو۔ رشتہ داری کے تعلقات، امیر اور غریب کی حیثیت، حتیٰ کہ اپنی ذات کے مفاد وغیرہ۔ ان میں سے کوئی چیز بھی عدل پر اثر انداز نہیں ہونی چاہیئے۔ فیصلہ حق کے مطابق کرو خواہ وہ خود تمھاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ کی جائے۔ سورۂ انعام میں ہے:۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔ (۶/۱۵۲)۔ "تم جب بھی کوئی بات کرو، عدل و انصاف کی رُو سے کرو، خواہ وہ متعلقہ شخص تمھارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔" عدل کا مدار، شہادت پر ہوتا ہے، اور شہادت کے بارے میں قرآن کریم نے ایک ایسا بلند معیار مقرر کیا ہے جس کی نظیر شاید ہی کہیں اور ملے۔ فرمایا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۴/۱۳۵)

اس نظام کے قیام کے لئے، جس میں حال اور مستقبل دونوں کی خوش گواریاں حاصل ہوتی ہیں، بنیادی شرط یہ ہے

کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگران بن کر رہو (۴/۱۳۵)۔ عدل کے لئے ایک بنیادی شرط سچی شہادت ہے۔ تم شہادت نہ مدعی کی طرف سے دو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو اور علیشیہ عدل و انصاف کو مدِّنظر رکھ کر سچی سچی شہادت دو، خواہ یہ شہادت (اور تو اور) خود تمہارے اپنے خلاف جاتے یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں بھی کوئی امتیاز نہ کرو (حتیٰ کہ دشمن سے بھی عدل کرو (۵/۸)۔ تم جادۂ حق و صداقت سے ہٹ کر، ان کے خیر خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی خیر خواہی کی زیادہ فکر ہے۔ اس کا خیال رکھو کہ تمہارے جذبات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ کوئی پیچ دار بات کرو، نہ شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے تمام اعمال (جذبات و رجحانات تک، سے اچھی طرح واقف ہے۔

(۸) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قرآن میں عدل و احسان کا حکم ہے۔ (۱۶/۹۰ نیز ۷/۲۹)۔ عدل یہ ہے کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دی جائے۔ اور "احسان" یہ کہ اس جرم کی وجہ سے مظلوم (مستغیث) کو جو نقصان ہوا ہے، اس کو پورا کیا جائے۔ لہذا، عدل یہی نہیں کہ مجرم کو سزا دی جائے۔ عدل کا یہ تقاضا بھی ہے کہ مستغیث کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ یہ اسلامی مملکت کی اولین ذمہ داری ہے (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر ملے گی)۔

(۲) عدل کے متعلق اصولی احکام

(۱) مجرم کا تعاقب کر کے اُسے قانون کے مطابق سزا دینا، حکومت کا فریضہ ہے۔ اسے قصاص کہتے ہیں۔ اسی میں قوم کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سورۃ بقرہ میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ (۲/۱۷۸)

اے جماعتِ مومنین! تم پر یہ فریضہ عائد کیا جاتا ہے کہ قاتل کو اس کے جرم کی سزا دی جائے (یعنی اسے خود معاشرہ یا نظام کے خلاف جرم سمجھا جائے، افرادِ متعلقہ کے خلاف نہیں)

سزا کے سلسلہ میں، عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ مدِّنظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی اس میں بڑے اور چھوٹے

کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سوال مقتول کی یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضاے عدل کا ہے۔ جس کی رو سے ہر انسانی جان یکساں قیمت رکھتی ہے۔ (مثلاً) اگر قاتل آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اس کا عورت ہونا اُسے سزا سے نہیں بچا سکے گا۔ اسے بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔

جرمِ قتل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ قتل بالارادہ (قتلِ عمد) یا سہواً (نادانستہ) قتل۔ اوّل الذکر کی صورت میں سزائے موت ہے (زرِ فدیہ نہیں) ـــــ یا جرم کی نوعیت کے لحاظ سے، انتہائی سزا سے کمتر کوئی اور سزا دی ــــ لیکن سزا کو جرم کی حد سے بڑھ نہیں جانا چاہیئے۔ (۱۷/۳۳)

لیکن اگر قتل عمداً نہیں کیا گیا۔ یونہی سہواً ہو گیا ہے تو اس صورت میں (۴/۹۲ کے مطابق) دیت (معاوضہ) کی سزا دی جائے گی۔ اس دیت (کی رقم سے) اگر مقتول کا وارث برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے، تو اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے (۲/۱۷۸)۔ اس صورت میں مجرم کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ طے ہو گیا ہے اس کی پابندی کرے۔ اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے (قتلِ سہو کی سزا مقرر کرنے میں) تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے، تم سب کی صلاحیتیں مناسب نشو و نما پاتی رہیں۔ لیکن جو شخص اس طرح معاملہ طے ہو جانے کے بعد، زیادتی کرے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

اس سے واضح ہے کہ قتل کی صورت میں، مصالحت صرف قتلِ خطا (سہوا) میں ہو سکتی ہے، قتلِ عمد میں نہیں۔ قتلِ عمد میں مجرم کو سزا دی جائے گی۔ یہی قانونِ قصاص ہے جس کے متعلق کہا کہ:-

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ - (۲/۱۷۹)

اگر تم سطحی جذبات سے ہٹ کر، عقل و فکر کی رُو سے غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قصاص کے قانون میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے تم لاقانونیت کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

(۲) جرم کی سزا خود مجرم بھگتے گا۔ کوئی دوسرا نہیں۔ نہ ہی کوئی بے گناہ کسی دوسرے کے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے گا۔ "ہر بوجھ اٹھانے والا اپنا بوجھ خود اٹھائے گا" وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) "جو کرے گا وہی بھرے گا، اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"

(۳) نظامِ عدل ایسا ہونا چاہیئے جس میں کوئی شخص مجرم کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جا سکے۔

نہ ہی مجرم سے کچھ لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے۔ نہ ہی کوئی اس کی (سزا سے بچنے کے لئے) مدد کر سکے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۔ (۲/۴۸)

کوئی شخص کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی (۶/۱۶۵)، نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکے گی۔ نہ ہی کسی سے، اُس کے جُرم کے معاوضہ میں کچھ (رشوت) لے کر، اسے چھوڑ دیا جائے گا اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی مدد کو پہنچ سکے گا۔

یہ اس دنیا میں بھی ہوگا جب (قرآن کا) نظامِ عدل قائم ہوگا، اور آخرت میں بھی، جب تمام فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے ہوں گے۔

(۴) مجرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق ہوگی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس باب میں اصول یہ ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۔ (۴۲/۴۰)۔ سزا بمطابق جرم۔ اس اصول کی تائید و وضاحت متعدد دیگر آیات میں کی گئی ہے جن کے حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (۲/۱۹۴؛ ۱۰/۲۷؛ ۱۶/۱۲۶؛ ۲۲/۶۰؛ ۴۰/۴۰)

(۵) مجرم میں اگر اصلاح کا امکان ہو تو اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ۔ (۴۲/۴۰) جو شخص کسی کے جرم کو معاف کر دے اور یوں اس کے لئے اصلاحِ خویش کا موقعہ بہم پہنچائے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں ہوگا۔

(۶) جرم ثابت ہونے سے پہلے ملزم کو بے گناہ سمجھا جائے گا اور اس کے متعلق نیک ظن رکھا جائے گا۔ لہٰذا تفتیش کے دوران ملزم پر کسی قسم کی زیادتی کرنا یا اسے قصور وار تصور کر لینا، اسلامی ضابطہ کے خلاف ہوگا۔ اس عرصہ میں اس کی حیثیت ایک بے گناہ انسان کی سی ہوگی۔ سورۃ نور میں عہدِ رسالتمآبؐ کی کسی خاتون کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض فتنہ پردازوں نے اس عفت مآب کے خلاف تہمت تراشی اور اس افواہ کو معاشرہ میں پھیلا دیا۔ قرآن کریم نے اس کا سخت نوٹس لیا اور مسلمانوں سے کہا کہ شر پسندوں نے تو یہ افواہ اڑائی ہی تھی لیکن تمھیں کیا ہو گیا کہ تم نے بھی اسے بلا تحقیق و تفتیش صحیح باور کر لیا۔ تم نے جب ایسی بات سنی تھی تو حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے تھا اور تمھارا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲)۔ وَهٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶)۔ یہ صریح بہتان ہے۔ یہ بہت بڑا افترا ہے۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ کسی کے خلاف کوئی الزام عائد کیا جائے تو جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے، ملزم کو مجرم نہیں سمجھ لینا چاہیئے اور تحقیق سے پہلے

اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے۔

(۷) کسی فعل کو قانوناً جرم قرار دینے سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہو اس پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ بالفاظِ دیگر قانون کو کسی سابقہ تاریخ سے نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (۴/۲۳)۔ "جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا" اس کا اصول ہے۔ (نیز ۸/۳۸، ۵/۹۵)

(۸) وہی فعل جرم کہلائے گا جو بالارادہ سرزد ہو۔ سورۂ احزاب میں ہے۔ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (۳۳/۵) بھول چوک سے کوئی لغزش ہو جائے تو وہ جرم نہیں۔ ہاں، جو کام دل کے ارادے سے کیا جائے وہ قابلِ مواخذہ ہے۔ اگر کسی سے جہالت سے کوئی غلط قدم اٹھ جائے اور وہ اس کے بعد تائب ہو تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے (۴/۱۷)۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لوگ قانون کی طرف سے لاپرواہی برتنے لگ جائیں۔ لاپرواہی کو الگ جرم قرار دینا چاہیئے۔ مثلاً قتلِ عمد (بالارادہ) کی سزا موت ہے۔ لیکن قتل بالخطاء (سہواً قتل) کی سزا دیت (خون بہا) ہے۔ (۴/۹۲، ۹۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "لاپرواہی" کو بھی قابلِ مواخذہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بالارادہ فعل جتنا سنگین جرم نہیں۔

(۹) کسی سے کوئی جرم جبراً کرایا جائے تو وہ مجرم نہیں ہوگا۔ (۱۶/۱۰۶)۔ "جبر" کس کس قسم کا ہو سکتا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔

(۱۰) کبائر الاثم (بڑے بڑے جرائم) سے بچنے والوں سے اگر کبھی کبھار کوئی خفیف سی لغزش ہو جائے تو وہ قابلِ معافی ہونی چاہیئے۔ مومنین کے متعلق کہا۔ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲ نیز ۴/۳۱) "یہ لوگ بڑے بڑے جرائم اور فواحش سے مجتنب رہتے ہیں بجز اس کے کہ ان سے یونہی کوئی نادانستہ معمولی سی قابلِ ملامت حرکت سرزد ہو جائے۔"

(۱۱) جو کسی کو غلط راستے پر ڈالتا ہے، اس کے جرائم میں وہ خود بھی شریک ہوتا ہے۔ مجرمین کے متعلق کہا کہ — لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ (۱۶/۲۵ ؛ ۲۹/۱۳)۔ "وہ اپنے جرائم کا پورا بوجھ اپنی کمر پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے جرائم کا بھی کچھ بوجھ جنہیں انہوں نے جانے بوجھے بغیر غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔" اسی طرح خود جرم کر کے اسے دوسرے کے سر تھوپنے والا دوہرے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

وَمَن يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا۔ (۴/۱۱۲)

جو شخص جرم یا خطا کا مرتکب تو خود ہو اور اسے تھوپ دے کسی دوسرے بے گناہ کے سر تو سوچو کہ یہ کتنا سنگین جرم ہے۔ اس طرح اس نے اپنے اوپر دوہرا بوجھ لاد لیا۔ ایک تو اس جرم کا بوجھ جو اس نے خود کیا تھا اور دوسرا اس بہتان کا بوجھ جو اس نے دوسرے پر لگایا۔

(۱۲) سزا کا فیصلہ کرتے وقت مجرم کے ماحول، تربیت، ذہنیت، نفسیاتی حالات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے یہ وجہ ہے کہ لونڈی کے جرمِ زنا کی سزا آزاد عورت سے نصف رکھی گئی ہے (۴/۲۵)۔ اور ازواجِ رسول اللہ ؐ کے لئے سزا دگنی۔ (۳۳/۳۰)۔ واضح رہے کہ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب عرب معاشرہ میں غلام اور لونڈیاں ہوا کرتی تھیں قرآنِ کریم نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا اس لئے اب لونڈیوں کا سوال نہیں رہا نہ ہی ازواجِ رسول اللہ ؐ کا سوال۔ اس قسم کی آیات سے ایسے اصول مستنبط کئے جا سکتے ہیں جو ہمارے معاشرہ کے حالات پر منطبق ہوں۔

(۱۳) "سیئات کو حسنات سے دور کیا جائے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرہ میں فضا ایسی پیدا کی جائے جس سے لوگ از خود جرائم سے مجتنب ہیں۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ (۱۱/۱۱۴ نیز ۲۳/۹۶؛ ۲۸/۵۴) قرآنِ کریم کا عالمگیر اصول ہے جس سے مراد یہ ہے کہ سیئات (برائیوں) کا ازالہ حسنات (بھلائیوں) کے ذریعے کرنا چاہیئے۔ یہ اصول بڑا جامع اور نہایت خوشگوار انقلاب لانے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا، جرم کی سزا دیتے وقت، معاشرہ کی عام حالت کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

(۱۴) عدل سے مقصد صرف مجرموں کو سزا دینا ہی نہیں بلکہ مظلوم کے نقصان کو پورا کرنا بھی ہے۔ اس ضمن میں، قرآنِ مجید میں جرمِ قتل کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مقتول تو اس دنیا سے چلا جاتا ہے لیکن اس سے، اس کے وارثوں کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کہا کہ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا (۱۷/۳۳)۔ جو شخص بے گناہ مارا جاتا ہے تو نظامِ خداوندی اس اقتدار کی بنا پر جو اُسے حاصل ہے، اس کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا۔ اس مثال سے ایسا اصول مستنبط کیا جا سکتا ہے جس کا اطلاق اسی قسم کے تمام واقعات پر ہو سکے۔ جہاں تک مظلوم کا نقصان پورا کرنے کا تعلق ہے، اس باب میں مظلوم مدعی ہوگا اور حکومت مدعا علیہ۔ اس لئے کہ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر بسنے والے افراد کی جان، مال، عزت۔ آبرو (ہر شے) کی حفاظت کرے۔ لہٰذا، اگر کسی شخص کا نقصان اس کی اپنی غفلت یا لاپرواہی سے نہیں ہوا تو اس کی تلافی حکومت کے ذمے ہوگی۔ اور اس نقصان میں مالی یا جسمانی نقصان ہی شامل نہیں، ذہنی اور قلبی اذیت بھی اس میں شامل ہے کیونکہ حکومت، افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ‎(۲/۳۸)‎۔ (نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن)۔ خوف میں طبعی نقصان شامل ہوگا اور حزن میں ذہنی اور قلبی اذیت۔

(۱۵) حکومت اپنی ہر ذمہ داری کے لیئے اسی طرح عدالت کے سامنے جواب دِہ ہوگی جس طرح افرادِ معاشرہ۔ (اور تو اور) اسلامی حکومت کے سب سے پہلے سربراہ حضور نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے اعلان کرایا گیا کہ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ ‎(۶/۱۴)‎۔ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں"۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ‎(۶/۱۵)‎۔ اگر میں بھی ان قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اس لیئے قانون سے مستثنیٰ! نہ حکومت قرار پا سکتی ہے نہ اربابِ حکومت میں سے کوئی۔ حتیٰ کہ سربراہِ مملکت بھی نہیں۔

(۱۶) جرائم کے سلسلہ میں قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ

۱۔ ہر جرم کا اثر مجرم کی اپنی ذات پر پڑتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے مجرم خود اپنے خلاف جرم کرتا ہے۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ‎(۴/۱۱۱)‎۔ "جو شخص کوئی جرم کرتا ہے، وہ خود اپنی ذات کے خلاف جرم کا مرتکب ہوتا ہے"۔ یعنی اس کا پہلا اثر خود اس کی اپنی ذات پر پڑتا ہے۔ جرم کا یہ اثر عدالت کی سزا سے نہیں مٹ سکتا۔

۲۔ بعض جرائم ایسے ہیں جن کا اثر مجرم کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ دوسروں کا اس سے نقصان نہیں ہوتا۔ مثلاً نگاہ کی خیانت اور دل کے بُرے ارادے ‎(۴۰/۱۹)‎۔ یہ جرائم عدالت کے حیطۂ اقتدار میں نہیں آسکتے۔ لیکن ایسے جرائم جن کا اثر ان کے مرتکب کی ذات تک ہی محدود کیوں نہ ہو (مثلاً منشیات کا استعمال) لیکن اگر انھیں قانون نے جرم قرار دیا ہے تو یہ عدالت کے حیطۂ اقتدار میں آجائینگے۔

۳۔ عدالت کے حیطۂ اقتدار میں وہی جرائم آسکتے ہیں جو مجرم سے عملاً سرزد ہوئے ہوں۔ (مثلاً) کوئی شخص کسی کے مال چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اسے اس کا موقع نہیں ملتا، تو اس ارادے کا اثر تو اس کی ذات پر پڑے گا لیکن وہ قانون کی نگاہ میں مجرم قرار نہیں پائے گا۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی نگہ انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات تک پر بھی ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ایسا شخص عدالتی قانون کی نگاہ میں تو مجرم قرار نہیں پاتا لیکن خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مجرم قرار پا جاتا ہے۔ اسی لئے وہ انسان کے خیالات اور ارادوں کی اصلاح پر زور دیتا ہے۔ اگر انسان کے ارادوں کی اصلاح ہوجاتے تو جرم سرزد ہی نہیں ہو سکتے۔

اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ جرم کے فلسفہ کی تعلیم اس طرح عام کرے کہ افرادِ معاشرہ ہر قسم کی غلط روی اور قانون شکنی کے نقصانات کو علیٰ وجہ البصیرت محسوس کریں۔ سورۃ النساء کی آیات (۴/۱۰۷-۱۱۲) بڑی بصیرت افروز ہیں اور معاشرہ سے جرائم ختم کرنے کے لئے نہایت مؤثر تدابیر کی حامل حقیقت یہ ہے کہ خدا کے "قانونِ مکافاتِ عمل اور حیات بالآخرت پر دلائل و براہین کی روشنی میں ایمان، بہت بڑی اصلاحی قوت ہوتا ہے۔

(۱۷) سزا کے سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے جو سزائیں خود ہی تجویز کر دی ہیں، وہ ان جرائم کی انتہائی سزائیں ہیں اور ان معاشرتی اور معاشی حالات کے پیشِ نظر تجویز کی گئی تھیں جو اس زمانے میں عام تھے۔ یہ سزائیں اُنہی جیسے حالات میں دی جائیں گی۔ اگر حالات وہ نہ رہیں تو پھر ان میں اسلامی حکومت، حالات کے مطابق تبدیلی کر سکتی ہے۔ اس کی ایک نظیر خود قرآن کریم میں موجود ہے ــــ اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت کی سزا ــــ (۱) قتل کرنا یا (۲) سُولی چڑھانا۔ یا (۳) ہاتھ پاؤں کاٹ دینا۔ یا (۴) جلاوطن کر دینا (یا نظر بند کر دینا ہے)۔ (۵/۳۳) متعدد سزائیں تجویز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس قسم کے حالات ہوں ان کے مطابق سزا دی جائے۔

قرآن کی تجویز کردہ سزائیں منسوخ نہیں۔ نہ ہی انہیں کوئی منسوخ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ مشروط بہ حالات ہیں۔ اور جن جرائم کی سزائیں اس نے خود تجویز نہیں کیں، ان کی سزائیں اسلامی حکومت مقرر کرے گی۔ وہ حکومت اس کا بھی فیصلہ کرے گی کہ معاشرتی احکام میں سے کون کون سے احکام تعزیری قوانین کی فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

(۹) بدنی سزائیں

قرآن کریم نے جرائم کی بدنی سزائیں تجویز کی ہیں۔ قید بطور سزا کا ذکر قرآن میں نہیں۔ کسی عورت سے عام بیحیائی کی بات سرزد ہو جانے سے، اسے گھر میں محبوس کر دینے کا ذکر آیا ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۔ (۴/۱۵)

اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکت سرزد ہو (جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہو سکتی ہے) تو ان کے خلاف، اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ اس کی شہادت دیں (اور جرم ثابت ہو جاتے) تو، ان عورتوں کو باہر آنے جانے سے روک دو تاآنکہ انہیں موت آجائے۔ یا خدا کا قانون اُن کے لئے

ایسی صورت پیدا کر دے جس سے وہ اِس قسم کی حرکات سے رُک جائیں ـــــ مثلاً اگر وہ شادی شدہ نہیں تو ان کی شادی ہو جاتے۔ (زنا کی سزا کا ذکر ۲۴/۲ میں ہے اور تہمت لگانے کا ۲۴/۴ میں)

یا (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) فساد اور بغاوت کے سلسلہ میں نظر بندی کا ذکر (۵/۳۳-۳۴) میں ہے۔

سورۂ احزاب کی ایک آیت سے عادی مجرموں کو ملک بدر کر دینے کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس میں پہلے کہا گیا ہے:-

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ـ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳/۵۹)

اے نبی! تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے، اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے کپڑوں کے اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا پہن لیا کریں جس سے زینت نمایاں نہ ہو (۲۴/۳۱)۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جا سکیں (کہ شریف بیبیاں جا رہی ہیں) اور کوئی بدقماش انھیں تنگ نہ کرے۔ یہ چیز ان کے لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے حفاظت اور تربیت کا موجب بن جائے گی۔

اس کے بعد ہے:-

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ـ مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ـ (۳۳/۶۰-۶۱)۔

تم اتنی احتیاط برتو۔ اگر اس کے بعد بھی منافقین یعنی وہ لوگ جن کے دل میں خباثتیں بھری ہوئی ہیں، اور وہ فتنہ پرور جن کا کام ہی معاشرہ میں شر انگیز خبریں پھیلانا ہے، اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو پھر ان کے خلاف قوت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ اس سے یہ لوگ، کچھ عرصہ بعد، یہاں سے دور ہو جائیں گے اور ان تمام مراعات سے محروم کر دیئے جائیں گے (جو انھیں اسلامی مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں)۔ اگر ایس پر بھی اپنی سرکشی سے باز نہیں آئیں گے تو جہاں کہیں بھی ہوں گے، انہیں گرفتار کیا جائے گا اور سختی سے قتل کیا جائے گا۔

اس میں ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا سے اس کا اشارہ ملتا ہے کہ انھیں شہر (یا ملک) بدر کر دیا جائیگا۔

شہادت

—— (۳) ——

(۱) شہادت پر عدل کے ساتھ قائم رہو۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (۵/۸) "اے جماعتِ مومنین! تم عدل کی شہادت دینے کے لئے، عدل کو قائم رکھنے کے لئے محکم طور پر کھڑے ہو جاؤ اور ایسا کچھ کسی مفاد یا ذاتی مقصد کے لئے نہیں، بلکہ محض اللہ کی خاطر کرو"۔ اس نے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (۷۰/۳۳)۔ "وہ اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں"۔

(۲) بات ہمیشہ انصاف کی کرو خواہ اس کی زد خود تمہارے اپنے اوپر ہی کیوں نہ پڑے یا تمہارے والدین اور دیگر اعزہ پر۔ اس میں امیر اور غریب میں بھی فرق نہ کرو۔ جذبات کو غالب نہ آنے دو۔ موڑ توڑ کر بات نہ کرو۔ شہادت دینے سے پہلو تہی نہ کرو۔ اور تم نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ صرف خدا کے لئے گواہ بن کر گواہی دو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۴/۱۳۵)

اس نظام کے قیام کے لئے جس میں حال اور مستقبل دونوں کی خوش گواریاں حاصل ہوتی ہیں، بنیادی شرط یہ ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگران بن کر رہو (۵/۸)۔ عدل کے لئے ایک بنیادی عنصر سچی شہادت ہے۔ تم شہادت، نہ مدعی کی طرف سے دو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو اور ہمیشہ عدل و انصاف کو مدنظر رکھ کر سچی سچی شہادت دو۔ خواہ یہ شہادت (اور تو اور) خود تمہارے اپنے خلاف جائے یا

تمہارے والدین یا رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں بھی کوئی امتیاز نہ کرو (حتیٰ کہ دشمن سے بھی عدل کرو ۵/۸)۔ تم جادۂ حق و صداقت سے ہٹ کر، ان کے خیر خواہ مت بنو، خدا کو ان کی خیر خواہی کی زیادہ فکر ہے۔ اس کا خیال رکھو کہ تمہارے جذبات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی ہیچدار بات کرو، نہ شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے اعمال (جذبات و رجحانات تک) سے اچھی طرح واقف ہے۔

(۳) شہادت چھپاؤ نہیں۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ (۲/۲۸۳)۔ نہ ہی جھوٹ اور سچ کو ملا کر شہادت دو۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲)۔ نہ ہی جھوٹی گواہی دو۔ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ۔ (۲۵/۷۲)۔ "وہ کبھی جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔"

(۴) شہادت اسی کی ہے جسے ذاتی طور پر علم ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (۱۷/۳۶)

اور یاد رکھو! جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو (جس کی خود تحقیق نہ کر لو)، اس کے پیچھے مت لگو۔ (ذاتی تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ، تم اپنی سماعت و بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو، اور پھر ان معلومات کی بنا پر خود سے فیصلہ کرو، اور اس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچو۔ ان میں سے اگر ایک کڑی بھی گم ہو گئی تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائے گی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ خدا نے تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے، مجبور مشین نہیں بنایا۔ اور اس اختیار کے استعمال کے لئے ذرائع علم و تحقیق عطا کر دیئے ہیں۔ ان سے کام نہ لینے والا اپنی ذمہ داری سے جی چراتا ہے۔)

(۵) جب گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ حاضری سے انکار نہ کریں۔ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا۔ (۲/۲۸۲)۔ دوسری طرف اس کی بھی تاکید کی گئی کہ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ۔ (۲/۲۸۲)۔ نہ دستاویز لکھنے والے کو کسی قسم کی اذیت پہنچائی جائے اور نہ ہی گواہ کو۔

(۶) گواہوں کی صداقت میں اگر شبہ گزرے تو عدالت دوسرے گواہ طلب کر سکتی ہے۔

فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيَانِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا

اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ یَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا۔ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۔ (۵/۱۰۷-۱۰۸)

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انھوں نے سچی گواہی نہیں دی، تو جس پارٹی کے خلاف انھوں نے غلط گواہی دی تھی اس پارٹی کے دو گواہ سامنے آئیں اور خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی سابقہ گواہوں کے مقابلہ میں زیادہ سچی ہے۔ ہم حق سے ذرا تجاوز نہیں کریں گے۔ اگر ایسا کریں تو ہم مجرم قرار دیئے جائیں۔

(قانونِ خداوندی میں شہادت پر شہادت لینے کی گنجائش اس لئے رکھ دی گئی ہے کہ اس سے) اس امر کا امکان ہے کہ گواہ حقیقت کے مطابق شہادت دیں کیونکہ انھیں اس کا خدشہ ہوگا کہ دوسرے گواہوں کی شہادت سے ان کی شہادت کی تردید ہو جائے گی (اور اس طرح وہ مجرم بھی قرار پائیں گے اور معاشرہ میں ان کی بدنامی بھی ہوگی) اب تمھارے لئے ضروری ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان باتوں کو دل کے کانوں سے سنو۔ اگر تم اس راہ کو چھوڑ کر کسی دوسری راہ پر چل نکلے تو وہ راہ تمھیں کبھی منزلِ مقصود تک نہیں لے جائیگی۔

(۷) گواہ اپنوں میں سے ہونے چاہئیں۔ بجز اس کے کہ مجبوری کی حالت ہو۔ وصیت کے ضمن میں فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ۔ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ۔ (۵/۱۰۶)۔

اے جماعتِ مومنین! اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو (کیونکہ وصیت کرنا فرض ہے۔ ۲/۱۸۰) تو اس کے لئے گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سو تم اپنے لوگوں میں سے دو ایسے گواہ مقرر کر لو جو انصاف پسند ہو۔ لیکن اگر تم سفر کی حالت میں ہو، اور ایسی جگہ پر جہاں اپنے آدمی موجود نہیں اور وہاں موت کا سامنا ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ ہی گواہ بنالو۔

پھر جب ان کی شہادت کی ضرورت پڑے تو تمھارے جج انھیں صلوٰۃ کے بعد (مسجد میں) ٹھہرالیں (کیونکہ وہی تمھاری عدالت گاہ ہے)۔ اگر تمھیں شبہ ہو کہ وہ ویسے سچ سچ نہیں کہیں گے تو وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم نے اس گواہی کے عوض کسی سے کچھ نہیں لیا خواہ وہ ہمارا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ اور نہ ہی ہم سچی شہادت کو چھپائینگے۔

اگرہم ایسا کریں گے تو ہم مجرم ہوں گے۔

(۸) لین دین کے معاملہ میں تحریر کے لئے دو مردِ گواہ۔ اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے جزئی ہدایات تک نہایت تفصیل سے دی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک لین دین کے معاملہ کو س قدر صاف اور پختہ ہونا چاہیئے۔ ہم یہاں وہ ہدایات پوری کی پوری درج کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔ (۲/۲۸۲)

جب تم کسی سے ایک مقررہ مدت کے لئے، کچھ قرض لو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ اور چاہیئے کہ ایک لکھنے والا، تمھارے اس باہمی معاملہ کو عدل کے ساتھ لکھ دے۔ وہ اس سے انکار نہ کرے۔ جب اُسے اللہ نے علم عطا کیا ہے، تو اُسے چاہیئے کہ اُس سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ قرض لینے والا اس تحریر کو لکھوائے۔ کاتب کو چاہیئے کہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرے اور جو کچھ لکھوایا جائے اُس میں کسی قسم کی کمی (بیشی) نہ کرے۔

اگر قرض لینے والا کم عقل ہو، یا ضعیف ہو یا اس تحریر کو لکھوانے کی بھی قابلیت نہ رکھتا ہو، تو اس کی طرف سے اس کا کوئی دوست یا سرپرست عدل و انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔

اور ایسے معاملات کے وقت، اپنے میں سے دو مرد بطور گواہ بھی بلا لیا کرو۔ اگر کسی وقت دو مرد موجود نہ ہوں، تو ان میں سے جن پر فریقین رضامند ہوں، ایک مرد اور دو عورتیں، بطور گواہ بلا لیا کرو ـــ دو عورتیں

اس لئے کہ اگر ان میں سے کسی کو کچھ اشتباہ ہوجائے تو اُسے دوسری یاد دلا دے ۔ (۲/۲۸۲)۔ اور جب گواہ بلائے جائیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ انکار نہ کریں۔ قرض تھوڑا ہو یا بہت، اُس کی میعاد کے اندر، دستاویز لکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے، یہ چیز تقاضائے انصاف کے زیادہ قریب ہے، اور شہادت کو محکم بنانے کا طریق، اور شکوک و شبہات کے ازالہ کی عمدہ تدبیر۔

لیکن اگر تم آپس میں کوئی دست بدست سودا کرو جس کے لئے تم عام طور پر لین دین کرتے رہتے ہو، تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ اُسے تم ضبطِ تحریر میں نہ لاؤ۔ البتہ ایسی خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ ضرور رکھ لیا کرو۔ یہ بھی یاد رکھو کہ کاتب یا گواہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے۔ اگر تم ایسا کروگے تو یہ قانونِ خداوندی سے سرتابی ہوگی۔ تم ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اللہ تمھیں اِن قوانین کا (وحی کے ذریعے) علم عطا کرتا ہے ـــــ اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے ۔

اس کے بعد ہے :۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۚ فَإِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۚ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۸۳)

اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور تمھیں کاتب نہ مل سکے، تو قرض لینے والے کی کوئی چیز بطورِ ضمانت اپنے پاس رکھ لو۔ اور اگر تم ایک دوسرے پر اعتماد کرو، تو جس شخص پر اعتماد کیا گیا ہے، اسے چاہیئے کہ اپنی امانت کو (پوری پوری دیانت سے) واپس کر دے۔ اور اس طرح اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرے۔

اور تم شہادت کو کبھی نہ چھپاؤ۔ جو ایسا کرتا ہے، (تو اگر، لوگوں کو اس کا پتہ نہ بھی چلے، اور وہ ان میں معتبر بنا رہے۔ پھر بھی) اس کا نفس ضرور مجرم ہوتا ہے اور اس کی ذات کی نشو و نما کی قوتیں مضمحل ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ خدا کے قانونِ مکافات سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اُسے ہر بات کا علم ہوتا ہے ۔

"دو عورتوں" کی ضرورت کے متعلق قرآن نے خود ہی بات واضح کر دی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر ایک عورت بھول جائے یا (CONFUSED) ہوجائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔ اس سے دو باتیں واضح ہیں۔

(۱) یہ کہ اُس زمانے میں عورتوں کی حالت ایسی تھی کہ وہ (جہالت کی وجہ سے) دوسرے کا تو ایک طرف خود اپنا معاملہ بھی وضاحت سے بیان نہیں کر سکتی تھیں۔ (۲۸۲/۲) اور چونکہ انھیں اجتماعی امور میں حصہ لینے کے مواقع نہیں دیئے جاتے تھے اس لئے عدالت کے سامنے ان کا پریشان ہو جانا کچھ مستبعد نہیں تھا۔

(۲) دوسری عورت کی ضرورت اس وقت لاحق ہوتی تھی جب پہلی عورت کچھ بھول جائے یا اُسے الجھاؤ پیدا ہو جائے۔ اگر پہلی عورت کی حالت ایسی نہ ہو تو پھر نہ دوسری عورت دخل دے سکتی ہے نہ اُس کی گواہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ایک مرد کے عوض دو عورتیں بطور گواہ پیش نہیں ہوتی تھیں بلکہ گواہی ایک ہی کی کافی سمجھی جاتی تھی بشرطیکہ وہ عدالت میں آکر گھبرا نہ جائے۔

اس سے ظاہر ہے کہ عورت کو محض عورت ہونے کی جہت سے مردوں کے مقابلہ میں ناقص الاعتبار قرار نہیں دیا گیا، صرف عورت کی اُس مخصوص حالت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر وہ حالات نہ رہیں تو ایک عورت کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر تسلیم کی جائے گی۔

(۹) جیسا کہ شق (۷) میں بتایا گیا ہے، وصیت کے لئے کم از کم دو گواہ ہونے چاہئیں۔ (۱۰۶/۵)۔

(۱۰) جرم فحش (عام بے حیائی کی باتوں کے لئے) کم از کم، چار گواہ۔ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ۔ (۱۵/۴)۔ یاد رہے کہ یہ گواہی عام بے حیائی کی باتوں کے لئے ہے جرم زنا کے لئے نہیں۔

(۱۱) باعصمت عورتوں کے خلاف تہمت کے ثبوت کے لئے (کم از کم) چار گواہ۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (۴/۲۴)۔

جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسّی کوڑے لگاؤ۔ اور اس کے بعد ایسے ساقط الاعتبار لوگوں کی، جو دوسروں کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائیں، گواہی قبول نہ کرو (اور انھیں ان حقوق سے بھی محروم کر دو جو اسلامی مملکت کے شریف انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں) اور اگر وہ اس پر بھی اس سے باز نہ آئیں تو انھیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو (۴/۲۴)۔ اس لئے کہ یہ لوگ صحیح راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

لیکن تہمت اگر اپنی بیوی کے خلاف ہے اور گواہ نہیں ملتے تو قسم اٹھا لینا کافی ہوگا۔ سورۂ نور میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ـ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ـ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ـ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۴/۶-۹)

جو لوگ خود اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں، اور ان کے پاس سوائے اپنے آپ کے، اور کوئی گواہ نہ ہو، تو ایسے معاملہ میں یوں فیصلہ کیا جائے گا کہ مرد چار بار اللہ کو حاضر وناظر جان کر گواہی دے کہ وہ سچ کہتا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ (یعنی میں ان تمام حقوق و مفادات سے محروم کر دیا جاؤں جو مجھے (مملکتِ خداوندی) (اسلامی حکومت) کا شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔

(اس سے وہ عورت مجرم قرار پاجائے گی۔ لیکن، اگر وہ، اپنی مدافعت میں بھی) اسی طرح خدا کو حاضر وناظر جان کر گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹ بولتا ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو، (یعنی مجھے اس حلفِ دروغ گوئی کی سزا ملے) تو اس سے وہ بری الذمہ ہو جائے گی۔

(۱۲) طلاق کے آخری مرحلہ پر دو گواہ۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ـ (۶۵/۲)۔

جب عدت کا زمانہ ختم ہونے کو آئے تو اس وقت اس معاملہ پر پھر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ اگر نباہ کی صورت ممکن دکھائی دے تو خواہ مخواہ علیحدگی کیوں اختیار کرو۔ قاعدے اور قانون کے مطابق میاں بیوی کی زندگی بسر کرو۔ لیکن اگر نباہ کی کوئی صورت نہ رہے تو پھر قاعدے اور قانون کے مطابق علیحدہ ہو جاؤ۔ اور اس آخری فیصلہ پر اپنے میں سے دو گواہ مقرر کر لو جو کسی کی رُو رعایت نہ کریں، اور اسے فریضۂ خداوندی سمجھ کر، گواہی پر حق و انصاف سے قائم رہیں۔

(طلاق وغیرہ کے متعلق تفصیلی احکام آگے چل کر آئیں گے۔ یہاں صرف شہادت کی بات ہو رہی ہے)

(۱۳) گرد وپیش کے واقعات وحوادث سے استنباطِ شہادت (CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE) جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف اتہام کے سلسلہ میں قمیص کے واقعہ سے استنباط کیا گیا تھا۔ وہ گواہ واقعہ کا عینی شاہد نہیں تھا لیکن اس نے کہا یہ تھا کہ:۔

إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَٰذِبِينَ ۔ وَإِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّٰدِقِينَ ۔ فَلَمَّا رَءَا قَمِيصَهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِن كَيْدِكُنَّ ۔ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ۔ ($\frac{12}{26-28}$)

اگر یوسفؑ کا کُرتہ آگے سے پھٹا ہے تو یہ عورت سچی ہے اور یوسفؑ جھوٹا۔ اور اگر کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہے، تو عورت جھوٹی اور یوسفؑ سچا ہے۔ چنانچہ جب کُرتے کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹا تھا۔ (اس سے واضح ہوگیا کہ یوسفؑ سچا ہے اور عورت جھوٹی)۔ اس پر، اس عورت کے خاوند نے (بیوی سے) کہا کہ تم عورتیں بڑی مکار ہوتی ہو۔ تمہاری مکاریوں سے خدا کی پناہ! تمہاری چالیں کس قدر گہری اور تمہارے فریب کس قدر خطرناک ہوتے ہیں۔

(واضح رہے کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر بطور واقعہ کے کیا ہے)

احکامات

عائلی زندگی سے متعلق احکام

قرآن کریم میں، سب سے زیادہ تفصیلی احکام، عائلی زندگی سے متعلق ہیں۔ انسان کی تمدنی زندگی میں، گھر (HOME) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ صبح کو گھروں کے دروازے کھلتے ہیں اور افراد مختلف سمتوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اسے معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شام کو یہی معاشرہ پھر سمٹ کر گھروں میں محدود ہو جاتا ہے۔ انھی گھروں کے اندر، آنے والی قوم تیار ہوتی ہے۔ جس قسم کا گھر کا ماحول ہوگا اسی قسم کی بچوں کی تربیت ہوگی۔ اور جس قسم کی بچوں کی تربیت ہوگی اسی قسم کی کل کی قوم ہوگی۔

قرآن کریم، نظامِ ربوبیت (معاشی نظام) کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ہر فردِ کاسب، اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور جو کچھ اس طرح حاصل ہو اس سے جملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کی جائیں۔ یہ نظام بھی، اپنی سمٹی ہوئی شکل میں، گھر کے اندر عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ ایک گھر کا فردِ کاسب، اپنی کمائی کو سمیٹ کر اپنے لئے نہیں رکھ لیتا۔ نہ ہی وہ اپنی ضروریات کو باقی افرادِ خاندان کی ضروریات پر مقدم رکھتا ہے۔ اس کی کمائی تمام افرادِ خاندان کی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس سے، نہ تو وہ فردِ کاسب باقی افرادِ خاندان کے سر پر کوئی احسان دھرتا ہے اور نہ ہی لینے والے اسے بطور خیرات لیتے ہیں۔ دینے والا اسے اپنی ذمہ داری سمجھ کر دیتا ہے اور لینے والے اسے اپنا حق سمجھ کر لیتے ہیں، اور تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق سب اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی سرانجام دہی میں لگے رہتے ہیں۔ اسی سے ان میں باہمی تعاون کا جذبہ ابھرتا ہے اور فضا خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اسی خوشگوار

فضا کا نتیجہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور مودت کے وہ گہرے تعلقات ہیں جو عمر بھر قائم رہتے ہیں۔ اس طرح ایک اچھے گھر کا نقشہ معاشرہ کے لئے مثال کا کام دیتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے گھر کی زندگی کو اس قدر اہمیت دی ہے اور اسے مثالی نمونہ بنانے کے لئے تفصیلی احکام دیئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے بھی اس گوشہ کو احکام کے سلسلہ میں سب سے مقدم رکھا ہے۔

مرد اور عورت کی حیثیت

(۱)

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے ایک انسانی بچے اور دوسرے انسانی بچے میں کوئی تفریق اور تمیز روا نہیں رکھی جاسکتی۔ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (۷۰/۱۷) "ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ اس کا اصل الاصول ہے۔ ظاہر ہے کہ "نوعِ انسان" یا "بنی آدم" میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اس لئے دونوں یکساں تکریم کے مستحق ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں لڑکی کو لڑکے کے مقابلہ میں فروتر سمجھا جاتا تھا، اور لڑکی کی پیدائش پر افسردگی چھا جاتی تھی۔ قرآنِ کریم نے اس ذہنیت کی بڑی سختی سے مذمت کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ:-

اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ۔ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ۔ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (۱۶/۵۸-۵۹)۔ نیز (۴۳/۱۷)

جب ان میں سے کسی کو یہ خبر ملتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو اس کے چہرے کی رنگت سیاہ ہو جاتی ہے اور وہ غم میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ بیٹی کی پیدائش کی خبر کو اس قدر معیوب سمجھتا ہے کہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے ــــ اور سوچتا ہے کہ کیا بیٹی کو زندہ رکھ کر ہمیشہ کی ذلت برداشت کرے یا اسے زندہ دفن کرکے (اس ذلت سے نجات حاصل کرلے!)

اُف! کس قدر بُرا ہے یہ فیصلہ۔ جو یہ لوگ اپنی معصوم بچیوں کے متعلق کرتے ہیں!!

معاشرہ میں لڑکیوں کی اس پوزیشن کا نتیجہ تھا کہ انھیں علم و ہنر سے عاری رکھا جاتا۔ انہیں بے سمجھ اور ناقص العقل تصور کیا جاتا۔ نہ ان کی رائے کو کوئی وقعت دی جاتی، نہ انہیں اس قابل سمجھا جاتا کہ معاملات کے سلجھانے میں

ان سے مشورہ لیا جاتے۔ ظاہر ہے کہ جب عورت کو نسلاً بعد نسلٍ اس پوزیشن میں رکھا جائے تو اس کی ذہنی اور عقلی سطح پست سے پست تر ہوتی جائے گی؟ یہی تھی وہ عورت جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ۔ (۴۳/۱۸)

زیورات میں پلی ہوتی۔ اور کیفیت یہ کہ خود اپنا کیس (معاملہ) بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔ اس کی یہی کمی تھی جس کی بنا پر (جیسا کہ شہادت سے متعلق عنوان میں بتایا گیا ہے) قرآن نے کہا کہ اگر کسی معاملہ میں عورت کو عدالت میں بطور گواہ پیش ہونا پڑے تو اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی کھڑی ہو جائے تاکہ اگر وہ کسی جگہ بھول جائے یا اسے الجھاؤ پیدا ہو جائے (CONFUSE ہو جائے) تو وہ اس کی مدد کر سکے۔ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (۲/۲۸۲)۔ قرآنِ کریم نے اس مقام سے عورت کو اٹھایا اور مناسب تعلیم و تربیت سے اسے زندگی کے ہر گوشے میں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ اس نے مردوں سے کہا کہ عورت کو ذلّت کی نگاہ سے مت دیکھو۔ اس لئے کہ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ۔ (۴/۲۵)، "تم ایک دوسرے میں سے ہو" البتہ بعض فطری فرائض (مثلاً افزائشِ نسل اور بچوں کی پرورش و تربیت) کے سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کی بعض خصوصیات منفرد ہیں — یعنی جو ایک کو حاصل ہیں وہ دوسرے کو نہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو کاروبارِ حیات میں، تقسیمِ عمل کے لحاظ سے ایک گوشے میں مردوں کو کچھ برتری حاصل ہے تو دوسرے میں عورتوں کو فوقیت۔ فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (۴/۳۴ نیز ۴/۳۲) سے یہی مفہوم ہے۔ اپنے فطری فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے عورت کی زندگی کا بیشتر حصہ، اولاد کی پیدائش اور پرورش کے لئے وقف رہتا ہے جس میں وہ خود کچھ کمانے کے قابل نہیں رہتی۔ اس لئے قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ (گھر کی زندگی میں) عورت کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ (۴/۳۴)۔ قَوّٰمُوْنَ کے معنی ہیں دوسرے کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا ذمہ دار — اس کی وضاحت اس لئے کر دی گئی کہ مرد کے دل میں کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ میں کما کر لاتا ہوں اور یہ (بیوی) بیٹھی مفت میں کھاتی رہتی ہے، اور اس طرح اسے اپنا دستِ نگر سمجھ کر ذلیل و حقیر خیال نہ کر لے۔ قرآنِ کریم نے مرد پر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عائلی زندگی تم دونوں (میاں بیوی) کا مشترکہ معاملہ ہے۔ اس میں جن فرائض کو عورت سرانجام دے رہی ہے وہ تمہارے بس کے نہیں۔ اس لئے تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس کی (اور بچوں کی) ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا انتظام کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم نے عورت کو اپاہج بنا کر یکسر مردوں کا آستاں افتادہ بنا دیا ہے۔ یہ تو صرف عائلی زندگی میں تقسیمِ عمل کے لحاظ سے ہے،

ورنہ عورت بھی کما سکتی ہے اور اپنی کمائی کی آپ مالک بن سکتی ہے۔ سورۃ نساء میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔ (۴/۳۲)

مرد جو کچھ کمائیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کچھ کمائیں وہ ان کا حصہ۔

چونکہ عائلی زندگی میں، اہل خانہ (بیوی اور اولاد) کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری مرد کے سر پر عاید ہوتی ہے، اس لئے ماں باپ کے ترکہ میں لڑکی کا حصہ، لڑکے کے مقابلہ میں نصف رکھا گیا ہے (تفصیل اس کی "وراثت" کے عنوان میں ملے گی)۔

معاملاتِ زندگی میں، اس فرق کے بعد، مردوں اور عورتوں کی حیثیت بالکل یکساں ہے اور یکساں بھی ایسی کہ میاں بیوی دونوں کے لئے قرآن میں زوج کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگر کسی چیز کے دو حصے ایسے ہوں کہ ان میں سے ایک کے بغیر دوسرا نامکمل رہ جائے تو ان میں کا ایک حصہ، دوسرے کا زوج کہلاتا ہے۔ یعنی ان میں کا ہر ایک حصہ دوسرے کی تکمیل کا باعث ہے ـــــ جیسے گاڑی کے دو پہیے کہ اگر ان میں سے ایک نہ ہو یا کمزور یا چھوٹا ہو تو دوسرا حصہ بیکار رہ جاتا ہے۔ یہ ہے میاں بیوی کا باہمی تعلق اور زندگی کی گاڑی میں ان کی پوزیشن۔ جہاں تک ایک نوع یا جنس ہونے کا تعلق ہے، انسان ہونے کی جہت سے کوئی استعداد ایسی نہیں جو صرف مرد کو حاصل ہو اور عورت کو نہ دی گئی ہو۔ اس لئے کوئی کام ایسا نہیں جسے صرف مرد کر سکیں، عورتوں میں اس کے کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ دیکھئے قرآن کریم ان دونوں کی خصوصیات کا ذکر کس طرح متوازی حیثیت سے کرتا ہے جب کہتا ہے کہ:۔

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا۔ (۳۳/۳۵)

یہ واقعہ ہے کہ جس طرح مرد قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والے ہو سکتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی ہو سکتی ہیں جس طرح مرد بلند صداقتوں پر یقین رکھنے والے ہو سکتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جس طرح مرد اپنی صلاحیتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی ہو سکتی ہیں جس طرح مرد اس قابل ہیں کہ وہ اپنے کردار سے اپنے ایمان کو سچ کر دکھائیں اسی طرح عورتیں بھی اس

قابل ہیں۔ جس طرح مردوں میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ سخت مصائب میں بھی ہمت نہ ہاریں اسی طرح عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ جس طرح مرد ذمہ داریوں کے احساس سے جھکتے چلے جا سکتے ہیں، عورتوں میں بھی ایسا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی یہ مادہ ہے۔ جس طرح مرد اپنے آپ پر پورا پورا کنٹرول رکھ سکتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی رکھ سکتی ہیں۔ جس طرح مرد اپنی عصمت کی حفاظت کر سکتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ جس طرح مرد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھیں اسی طرح عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔

جب مردوں اور عورتوں میں یہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں تو پھر ان کے اعمال کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ اس لئے دونوں کے لئے یکساں طور پر سامانِ حفاظت اور اجرِ عظیم ہے۔

آپ دیکھئے کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ اس کے لئے مردوں میں تو صلاحیت ہے لیکن عورتیں اس سے محروم رکھی گئی ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ:-

مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۔ (۴/۱۲۴)

مرد ہو یا عورت، جو بھی ایمان لانے کے بعد صلاحیت بخش کام کرے گا تو انھیں جنت کی زندگی مل جائے گی۔ اور ان کے اجر میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ دوسری جگہ ہے۔

لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (۳/۱۹۴؛ ۱۶/۹۷)

تم میں سے کوئی مرد ہو یا عورت، ہم کسی کے عمل کو رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ تم تو ایک ہی جنس کے افراد ہو پھر تم میں تفریق و تمیز کیسی؟

امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ (یعنی ان امور کو قانوناً نافذ کرنا جنھیں قرآن صحیح قرار دیتا ہے اور ان سے روکنا جنھیں وہ غلط کہتا ہے)۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں مرد اور عورت دونوں شریک ہو سکتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۔ (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب نصب العین حیات کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہوتے ہیں۔ یہ ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں ضابطۂ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور نوعِ انسان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر معاملہ میں خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے عطا کردہ سامانِ نشو و نما سے فیض یاب ہوں گے اور دنیا دیکھ لے گی کہ خدا کا قانون کس طرح قوت و حکمت پر مبنی ہے۔

اس لئے امورِ مملکت کی سرانجام دہی میں بھی عورت، محض عورت ہونے کی جہت سے، نااہل نہیں قرار دی جا سکتی۔

قرآنِ مجید میں بیان کردہ ان اصولوں سے واضح ہے کہ کوئی قانون جس کی رو سے مردوں اور عورتوں میں محض جنس کی بنا پر کسی قسم کی تفریق کی جائے (بجز ان امور کے جن کا ذکر قرآنِ کریم میں وضاحت سے آیا ہے — مثلاً وراثت میں حصہ) قرآنِ کریم کے خلاف ہوگا۔

میاں بیوی کے تعلقات

(۲)

(۱) نکاح

نکاح ایک معاہدہ ہے۔ سورۃ النسآء میں ہے۔ وَ اَخَذْنَ مِنْکُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا۔" اور تمھاری بیویوں نے تم سے پختہ عہد لے رکھا ہے"۔ اس معاہدہ کی رُو سے، ایک مرد اور عورت، ان حقوق اور ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے جو قرآن نے اس باب میں عاید کی ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے، باہمی رفاقت کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

(۲) نکاح کی عمر

قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر بلوغت ہے۔ سورۃ النسآء میں ہے وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰیٓ اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ...... (۴/۶)۔ تم یتیموں کے سرپرست بنو تو ان کی پرکھ کرتے رہو تا آنکہ وہ "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں۔ قرآن نے اس کا تعین نہیں کیا کہ "بلوغت کی عمر" کیا ہوتی ہے یہ (آب و ہوا اور دیگر عوامل وعناصر کی رو سے) مختلف ممالک میں مختلف ہو سکتی ہے۔ دوسری جگہ اسے "جوانی کی عمر" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ ..... ۶/۱۵۳)، (تا آنکہ وہ اَشُدَّ کی عمر تک پہنچ جائیں۔ یہ عمر کون سی ہوتی ہے اسے قرآنِ کریم نے خود ہی دوسری جگہ واضح کر دیا ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا۔ ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّکُمْ۔ ثُمَّ لِتَکُوْنُوْا شُیُوْخًا۔ (۴۰/۶۷)" پہلے تم حالتِ طفولیت میں ہوتے ہو۔ پھر بھرپور جوانی تک پہنچتے ہو۔ پھر بوڑھے ہو جاتے ہو" ان آیات کو سامنے رکھنے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ سورہ النسآء (۴/۶)

میں بَلَغُوا النِّكَاحَ کہا تھا۔ یعنی جب تک وہ نکاح کی عمر (بلوغت) کو نہ پہنچ جائیں۔ سورۃ انعام میں کہا۔ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔ (۶/۱۵۳) جب تک وہ اشد کی عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ اور (۲۲/۵) میں اشد کو طفولیت اور بڑھاپے کے درمیان بھرپور جوانی کی عمر سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر "بلوغت" ہے یعنی جب لڑکی اور لڑکا جوانی کو پہنچ جائیں۔ اس لئے نابالغ (یعنی جوانی کی عمر) سے پہلے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس عمر کا تعین اسلامی مملکت کرے گی۔

(۳) رضامندی

جس طرح معاہدۂ نکاح کے لئے فریقین کا بالغ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح، ان کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ فریقین (لڑکی اور لڑکے) کی رضامندی کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔ مردوں کے متعلق قرآن میں ہے۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳)۔ تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمھیں پسند ہوں اور عورتوں کے متعلق کہا کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ (۴/۱۹)۔ تمھارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ یہ حلال ہی نہیں۔

چونکہ نکاح کم سنی میں ہو نہیں سکتا اس لئے لڑکے یا لڑکی کی طرف سے کسی ولی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر عورت چاہے تو اپنے معاملات کے طے کرنے کے لئے کسی کو اپنا مختار بنا سکتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں جو کہا گیا ہے بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ۔ (۲/۲۳۷)۔ "جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے"، تو اس سے مراد وہ شخص ہے جسے عورت نے اپنا مختار کار قرار دیا ہو۔ یا خود عدالت، جو فسخ نکاح کی مجاز ہو۔

(۴) رسم نکاح

نکاح کے لئے قرآن نے کوئی رسم تجویز نہیں کی حتّٰی کہ اس میں "نکاح پڑھانے والے" کا بھی کوئی ذکر نہیں لیکن یہ ایک معاہدہ ہے اس لئے حکومت کا رائج الوقت قانون، معاہدات کی توثیق کے لئے جو ضابطہ مقرر کرے، اس کے مطابق اس معاہدہ کی توثیق بھی کرانی چاہیئے۔ حکومت کے لئے ضروری ہے کہ اس باب میں واضح ضابطہ متعین کرے۔ نیز نکاح کا اعلان بھی ضروری ہے۔ جس نکاح کو پوشیدہ رکھا جاتے، وہ قرآن کریم کی رُو سے جائز نہیں ہوگا۔ (۵/۵)

(۵) محرمات

قرآن کریم نے وضاحت سے بتا دیا ہے کہ کس کس مرد اور عورت کا باہمی نکاح نہیں ہوسکتا۔ یہ فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) کسی مسلمان مرد یا عورت کا، کسی مشرک عورت یا مرد سے نکاح جائز نہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۔ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۔ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (۲/۲۲۱)

تم کسی مشرک عورت سے شادی نہ کرو تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لے آئے۔ مشرک آزاد عورت سے، مومن لونڈی[1] بہتر ہوتی ہے خواہ اوّل الذکر تمھیں کتنی ہی جاذبِ نگاہ دکھائی کیوں نہ دے۔ اسی طرح مومن عورتیں، مشرک مردوں سے شادی نہ کریں، تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مشرک آزاد مرد سے مومن غلام[1] بہتر ہے۔ خواہ اول الذکر کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔ یہ اس لئے کہ متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والوں کا یک جا جمع کر دینا، جہنم پیدا کر دیگا۔ اِسی لئے خدا کا قانون تمھیں اس سے روکتا ہے۔ وہ تمھارے گھر کی زندگی کو جنّت کی آسودگیاں عطا کرنا اور تمھیں ہر قسم خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

خدا، اس طرح اپنے احکام کو لوگوں کے لئے واضح کر دیتا ہے کہ وہ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں۔

دوسری جگہ اَلْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کہا (۵/۵)۔ یعنی پاک دامن مومن عورتیں۔ یہاں عورت کے مسلمان ہونے کی شرط ہے۔

(۲) مسلمان مرد، اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (۵/۵) "اور اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں بھی تمھارے لئے حلال ہیں۔"

---

[1] یہ اسلام کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے جس میں ہنوز زمانۂ جاہلیت کی لونڈیاں اور غلام مسلمانوں کے ہاں موجود تھے۔ اسلام نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو آہستہ آہستہ اپنے معاشرہ کا جزو بنا لیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

انہی شرائط کے ساتھ جن کے ساتھ مومن عورتوں سے نکاح کیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمان عورت، کسی غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ آیت (۵/۵) میں صرف اہلِ کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے، اہلِ کتاب کے مردوں کے ساتھ نہیں۔ بنابریں،

۱۔ مسلمان مرد، مسلمان عورتوں یا اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ اور

۲۔ مسلمان عورتیں صرف مسلمان مردوں سے۔

واضح رہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی صرف اجازت ہے، حکم نہیں۔ اس اجازت کو اسلامی مملکت دینی یا ملّی مصالح کی خاطر عندالضرورت وقتی طور پر معطل کر سکتی ہے۔ یعنی وہ اس حکمِ قرآنی کو منسوخ تو نہیں کر سکتی، وقتی طور پر تعطل قرار دے سکتی ہے۔ جیسے (مثلاً) بعض دنوں میں گوشت کا ناغہ کر دیا جاتا ہے۔

(۳) سورۃ النسآء کی آیات ۴/۲۲ تا آیت ۴/۲۴ کی رو سے حسب ذیل عورتوں سے نکاح حرام ہے۔

ماں (حقیقی ہو یا سوتیلی)۔ بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، جس عورت کا دودھ پیا ہو، یا جو لڑکی دودھ میں شریک ہو۔ بیوی کی ماں۔ جس عورت سے تم نے شادی کی ہو اگر اس کی پہلے خاوند سے لڑکی ہو جس نے تمہاری زیرِ نگرانی پرورش پائی ہو تو اس سے بھی نکاح جائز نہیں۔ البتہ اگر اس عورت سے نکاح ہوا ہو لیکن مقاربت نہ ہوئی ہو تو پھر اس کی اس لڑکی سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی جائز نہیں کہ دو بہنیں بیک وقت نکاح میں ہوں نیز حقیقی بیٹے کی بیوی سے بھی نکاح جائز نہیں۔ نہ کسی ایسی عورت سے جو پہلے ہی کسی کے نکاح میں ہو۔[1] (۴/۲۲-۴/۲۴)

قرآنِ کریم نے رضاعت (دودھ پینے) کی تصریح خود نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ رضاعت (دودھ پینے) کی شرط کس طرح پوری ہوتی ہے۔ نہ ہی یہ کہ "رضاعی بہن بھائی" بننے کے لئے کیا شرائط ہیں۔ ان امور کی تصریح اسلامی حکومت کرے گی۔ یاد رہے کہ حرام صرف وہ عورت ہوگی جس کا دودھ پیا ہے۔ یا وہ لڑکی جو دودھ میں شریک تھی۔

اوپر کہا گیا ہے کہ ان عورتوں سے بھی نکاح جائز نہیں جو پہلے ہی کسی کے نکاح میں ہوں۔ لیکن قرآن نے اس میں ایک استثناء کی ہے۔ جو مسلمان عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے آ گئی تھیں اور ان کے خاوند پہلے موجود تھے۔ (ظاہر ہے کہ وہ خاوند غیر مسلم تھے ورنہ وہ بھی ہجرت کر کے آ جاتے)، ان سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی (۶۰/۱۰)

---

[1] آیت (۴/۲۴) میں جو محصنٰت کا لفظ آیا ہے تو اس کے معنی پاک دامن بھی ہوتے ہیں اور شادی شدہ عورتیں بھی۔ یہاں "شادی شدہ" ہی مراد ہیں۔

اگر کسی ملک میں اس قسم کے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں تو اسلامی حکومت، اس استثنار کی روشنی میں خصوصی احکام نافذ کر سکتی ہے۔

(نوٹ) منہ بولے رشتے حقیقی رشتے نہیں بن جاتے۔ سورۃ احزاب میں ہے۔ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (۳۳/۴) "تمہارے منہ بولے بیٹے، حقیقی بیٹے نہیں بن سکتے۔" (اس حکم کا ہر منہ بولے رشتے پر اطلاق ہوگا)۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رُو سے متبنیٰ کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔

سورۃ نور میں ایک آیت ہے:۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۔ وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۔ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۲۴/۳)

اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے: "زانی مرد، صرف زانیہ (عورت) یا مشرکہ سے نکاح کرتا ہے اور زانیہ عورت صرف زانی مرد یا مشرک سے نکاح کرتی ہے۔ مومنوں پر یہ حرام ہے۔" اس ترجمہ کی رو سے بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ زانی مرد کا نکاح کسی پاک باز مومن عورت سے جائز نہیں۔ اور اسی طرح زانیہ عورت کا نکاح کسی پاکباز مومن مرد سے جائز نہیں۔ زانی اور زانیہ یا تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں یا مشرکوں سے۔ لیکن یہ مفہوم ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ واضح ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں نکاح کا لفظ اپنے بنیادی معانی (مجامعت) کے لئے استعمال ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مومن مرد یا مومن عورت میں سے ایک بھی پاک باز رہنا چاہے تو فعل زنا کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ (زنا بالجبر کا سوال الگ ہے) یا اس فعل کا ارتکاب وہ کرتے ہیں جو قوانین خداوندی پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ مومن ایسا نہیں کر سکتے۔ اس سے فعلِ زنا کی شناعت کی وضاحت مقصود ہے۔ ہم نے اسی لئے محرمات کے سلسلہ میں ان کا ذکر نہیں کیا۔

——— (٠) ———

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، صدرِ اوّل میں، مکہ میں ایسی عورتیں تھیں جو خود اسلام تو لاچکی تھیں لیکن ان کے خاوند مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر، ہجرت کر کے مدینہ آگئیں تو قرآنِ کریم نے فیصلہ کیا کہ انھیں ان کے سابقہ خاوندوں کی طرف لوٹایا نہ جائے۔ مسلمان ان سے شادی کر لیں۔ (دیکھئے۔ ۶۰/۱۰) اس سے مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ترک کر دینے سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے لیکن اس کا قانونی فیصلہ اسلامی حکومت ہی کر سکتی ہے۔

——— (٠) ———

(۴) تعدّدِ ازواج

قرآنِ کریم نے وحدتِ زوج (یعنی ایک وقت میں ایک بیوی) کو بطورِ اصول بیان کیا ہے۔ اگر ایک بیوی سے نباہ کی کوئی صورت نہ رہے (تفصیل طلاق کے عنوان میں آئے گی) تو اس کی جگہ دوسری بیوی لائی جاسکتی ہے۔ "وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ"۔ (۴/۲۰) قرآن کے الفاظ ہیں۔ یعنی اگر تم موجودہ بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کرو تو ......۔ اس نکتہ کو اسی جگہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے یہ مقصد نہیں کہ تم جب جی چاہے ایک بیوی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آؤ۔ طلاق کن صورتوں میں دی جاتی ہے، اس کے لئے متعلقہ عنوان دیکھئے۔ بہرحال، قرآن کی رُو سے اصول وحدتِ زوج کا ہے۔ لیکن اگر کبھی کسی وجہ سے معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں (مثلاً جنگ کی وجہ سے) جن کی رُو سے بیوہ عورتوں اور جوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوجائے اور ان کے مسئلہ کا اور کوئی اطمینان بخش حل نہ مل سکتا ہو تو اسلامی حکومت وحدتِ زوج کے اصولی قانون میں استثنار کر کے اسکی اجازت دے سکتی ہے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ (چار تک) شادیاں کرلی جائیں۔ لیکن اس کے لئے دو شرائط ضروری ہیں۔ اول یہ کہ ایسا کرنے والا مرد، اپنی بیویوں میں عدل کرسکے، اور دوسری یہ کہ وہ اتنے بڑے کنبہ کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی ساقط ہوجائے تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہوسکتی۔ سورۃ النسآء میں ہے:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔ (۴/۳)

اور اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہوجائیں ۔۔۔ (مثلاً جنگ کی وجہ سے) ۔۔۔ کہ معاشرہ میں مرد ضائع ہوجائیں اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے (لڑکے، لڑکیاں) زیادہ رہ جائیں (بالخصوص بے شوہر عورتیں۔ ۴/۱۲۷)۔ اور اس مسئلہ کا کوئی خاطرخواہ منصفانہ حل نہ ملتا ہو۔ یا کہیں انفرادی طور پر ایسی صورت پیدا ہوجائے تو ایسے حالات میں تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کی خاطر، تم ان بے شوہر عورتوں سے، حسب پسند (جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں، ۴/۱۹) نکاح کرلو۔ (اس مقصد کے لئے "ایک مرد ایک بیوی" کے قانون میں استثنار کی جاتی ہے۔ اس صورت میں، جیسا بھی حالات کا تقاضا اور معاشرہ

کا فیصلہ ہو تم)، دو دو، تین تین۔ چار چار بیویاں تک نکاح میں لا سکتے ہو، لیکن اگر تم دیکھو کہ تم، اس طرح، مختلف افرادِ خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر اسی "ایک بیوی" والے قانون پر کاربند رہو۔ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم، اس سے قبل، اپنے نکاح میں لا چکے ہو (کیونکہ اس کے بعد تو غلام اور لونڈیوں کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا ہے)، بے انصافی (یا کثرتِ اولاد کے بوجھ) سے بچنے کے لئے یہ راہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

تعدد ازدواج کے متعلق قرآنِ کریم میں صرف یہی آیت ہے اور (جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں) یہ مشروط ہے "وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی" کی شرط کے ساتھ۔ اس شرط کے بغیر، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہی نہیں۔ واضح رہے کہ "یتامیٰ" کا لفظ صرف یتیم بچوں کے لئے ہی نہیں آتا، اس میں ناکتخدا جوان لڑکیاں اور عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں[1]۔ خود قرآنِ کریم میں "یَتٰمَی النِّسَآءِ" آیا ہے (۴/۱۲۷)، یعنی یتیم (بے شوہر) عورتیں۔

عدل کی شرط کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس باب میں "جذباتی عدل" ناممکن ہے۔ اس لئے اس سے اتنا ہی مقصود ہے کہ تم کسی ایک بیوی کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی ادھر لٹکی رہ جائے۔

وَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ فَتَذَرُوۡهَا کَالۡمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا (۴/۱۲۹)

یاد رکھو کہ جب ان حالات کے مطابق جن کا ذکر (۴/۳) میں آچکا ہے، تمہارے عقد میں ایک سے زیادہ بیویاں آ جائیں تو تمہیں ان سے عدل کرنا ہوگا۔ جہاں تک محبت اور جاذبیت کا تعلق ہے، مختلف بیویوں سے ایک جیسا سلوک ناممکن ہے۔ تم ہزار چاہو، ایسا نہیں کر سکو گے اس لئے کہ ان باتوں کا تعلق جذبات سے ہے۔ اور جذبات میں یکسانیت ممکن نہیں۔ جو عدل مقصود اور ممکن ہے وہ یہ ہے کہ تم کسی ایک بیوی کی طرف اس قدر نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی بالکل ادھر لٹکی رہ جائے — یعنی نہ خاوند والی، نہ بے خاوند کی — معاشرتی معاملات میں ان سب سے ایک جیسا سلوک اور برتاؤ کرو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رو سے تقاضائے عدل کو پورا کر دیگی۔ اور جو عدم مساوات، جذبات کی رو سے پیدا ہوگی، اس کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی۔ قانونِ خداوندی، اس طرح، حفاظت اور رحمت کی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے۔

یاد رہے کہ جب قوم کی طرف سے بیواؤں اور یتیموں کے مسئلہ کے حل کے لئے تعدد ازدواج کو ناگزیر سمجھا

---

[1] سند کے لئے دیکھئے میری لغات القرآن۔

جائے گا تو اس فیصلہ میں قوم کی عورتیں بھی برابر کی شریک ہوں گی۔ صرف مرد ہی اس قسم کا فیصلہ نہیں کرلیں گے اس سے ظاہر ہے کہ ان حالات میں بھی دوسری بیوی لانے کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہوگی۔ ورنہ گھر جہنم بن جائے گا۔

ان حالات کے علاوہ، ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں۔

(۵) لونڈیاں

نزولِ قرآن کے زمانے میں عربوں کے ہاں، غلام اور لونڈیاں عام معاشرہ کا جزو تھیں۔ قرآن نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا لیکن جو لونڈیاں اُس وقت ان کے گھروں میں موجود تھیں، انھیں یا تو ان کے خاندان کا جزو بنا دیا اور رفتہ رفتہ آزاد کر دیا۔ قرآن کریم میں " ازواج کے ساتھ جہاں جہاں " مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ " کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد وہ لونڈیاں ہیں جو اُس زمانے میں اُن لوگوں کے ہاں موجود تھیں۔ اب لونڈیوں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۶) نکاح کے لئے سہولتیں

جو لوگ نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں، معاشرہ کو چاہیئے کہ ان کے لئے نکاح کی سہولتیں مہیا کرے — قرآنِ کریم میں اسلامی معاشرہ سے کہا گیا ہے کہ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ۔ (۲۴/۳۲)۔ "جن لوگوں (مردوں یا عورتوں) کی شادی نہ ہوتی ہو، ان کے نکاح کا مناسب انتظام کرو" لیکن نکاح کرنا کوئی حکم نہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر مرد یا ہر عورت بالضرور نکاح کرے۔ جو مجرّد زندگی بسر کرنا چاہیں، یا جن کے لئے نکاح کی صورت نہ پیدا ہو سکے وہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا ۔ (۲۴/۳۳)۔ "جن لوگوں کے نکاح کا انتظام نہ ہو سکے، انھیں ضبطِ نفس سے اپنی عفت کی حفاظت کرنی چاہیئے" قرآنِ کریم نے بھوک کی اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی (بقدرِ ضرورت) اجازت دی ہے لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے حرام کاری کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے کہ بھوک پر انسان کا کنٹرول نہیں ہوتا لیکن جنسی خواہش تو انگیخت کرنے سے بیدار ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں اضطراری حالت کا سوال پیدا نہیں ہوتا[1] اسلامی معاشرہ ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے جس میں انسان کا خیال ہی اُدھر نہیں جاتا۔

---

[1] اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے چل کر سامنے آئے گی۔

(۷) مباشرت

ان حالتوں میں مباشرت منع ہے۔

(۱) ایامِ حیض میں۔ (۲/۲۲۲)

(۲) حالتِ روزہ میں۔ (۲/۱۸۷)۔ رمضان کی راتوں میں مباشرت کی ممانعت نہیں۔

(۳) حالتِ اعتکاف میں۔ (۲/۱۸۷)۔

(۸) مباشرت سے مقصد

قرآنِ کریم میں ہے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ۔ (۲/۲۲۳)۔ "عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تم اپنی کھیتیوں میں اپنی منشاء کے مطابق جاؤ"۔ اس سے ایک اہم حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ کھیتی میں ہمیشہ تخم ریزی کے لئے جایا جاتا ہے۔ اس لئے میاں بیوی میں مباشرت، افزائشِ نسل کے لئے ہونی چاہیئے محض حصولِ لذت کے لئے نہیں۔ اور افزائشِ نسل، ایک پروگرام کے مطابق کرنی چاہیئے جس کا تعین انفرادی اور اجتماعی مصالح کی روشنی میں کیا جائے۔ "کھیتی میں جب چاہے جاؤ" سے مراد یہی ہے کہ جب تم بچہ پیدا کرنا چاہو تو اس وقت مباشرت کرو۔ (فطرت کا نظام بھی یہی ہے۔ اس کے لئے دوسری جگہ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ۔ کہا ہے (۴/۲۴)، یعنی نکاح سے مقصد مادۂ تولید کا بہا دینا نہیں، اسے محفوظ رکھنا ہے۔

یہ بہرحال، قرآنی آیات سے ہمارا استنباط ہے۔

(۹) متاہل زندگی سے مقصد

ازدواجی زندگی سے مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو اور اس طرح گھر کی زندگی امن و سکون کی جنت در آغوشِ زندگی ہو۔ سورۃ الروم میں ہے:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۳۰/۲۱)

جامد مادہ سے جب زندگی کی ابتداء ہوئی تو وہ ایک جرثومہ کی شکل میں تھی۔ وہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصّوں

میں تقسیم میں ہوگیا تو اس کا ایک حصہ نر بن گیا اور دوسرا مادہ ــــ اس طرح تم ــــ مرد اور عورت ــــ ایک دوسرے کے زوج (جوڑے) بن گئے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کی رفاقت سے سکونِ قلب حاصل کرو۔ اس نے تم میں ایک ایسا گہرا رشتہ پیدا کر دیا جو تمہاری (مرد اور عورت دونوں کی) صلاحیتوں کی نشو ونما کا موجب بن گیا۔

میاں بیوی کے رشتے میں کس قدر یگانگت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے بڑے خوبصورت استعارہ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)۔ "وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں، تم ان کے لئے بمنزلہ لباس کے"۔ جہاں تک باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق ہے، قرآن نے اسے ایک جامع فقرہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ (۲/۲۲۸)۔ "جس قدر عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی قدر ان کے حقوق ہیں"۔ ہر ذمہ داری کے مقابلہ میں ایک حق[له] یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عورت کو جو فرائض طبیعی طور پر سرانجام دینے پڑتے ہیں، ان کے پیشِ نظر اکتسابِ رزق کی ذمہ داری مرد پر عاید ہوتی ہے (۴/۳۴)۔

ازدواجی زندگی سے رشتوں میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی نسبی رشتوں کے علاوہ سسرال کے رشتے بھی وجود میں آجاتے ہیں۔ فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَّصِهْرًا۔ (۲۵/۵۴)۔ اس میں نسبی اور سسرالی دونوں رشتے شامل ہیں۔

۸۔ مہر

سورۃ النساء میں محرمات کی تفصیل دینے کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ ...... (۴/۲۴) (۵/۵)۔ "ان عورتوں کے علاوہ باقی تم پر حلال ہیں بشرطیکہ تم انہیں نکاح کے لئے، چاہو کچھ مال دے کر"۔ اس مال کو اصطلاح میں مہر کہتے ہیں۔ مہر کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اس کے بجائے اس میں صدقہ یا اجور کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن قرآن نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ مہر کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ یہ بلا کسی معاوضہ کے خیال کے تحفۃً دینا ہوتا ہے۔ اس کے لئے قرآن نے نحلۃ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (۴/۴)۔ تم اپنی بیویوں کو ان کا مہر، تحفۃً یا بلا بدل اور بلا معاوضہ دو۔ تحفہ میں کسی معاوضے یا بدلے کا خیال قطعاً نہیں ہوتا۔

[له] اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ "مرد کا ایک حق فائق ہے"۔ تو اس کے لئے "عدت" کا عنوان دیکھئے۔

(۲) مہر کی کوئی مقدار قرآن نے مقرر نہیں کی۔ جو کچھ باہمی رضامندی سے طے پاجائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اسے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے (اسی لئے اسے فریضہ بھی کہا گیا ہے۔ ۲۳۶-۲۳۷/۲) اس لئے اسے استطاعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (اس سلسلہ میں آیت ۲۳۶/۲ سے بھی راہ نمائی ملتی ہے)۔ وسعت کے لحاظ سے یہ سونے کا ڈھیر بھی ہوسکتا ہے۔ (۲۰/۴)۔ اس آیت میں قِنطَارًا کے معنی سونے کا ڈھیر ہیں۔

(۳) مہر کی ادائیگی نکاح کے ساتھ ہی ہوجانی چاہیئے۔ لیکن سورۂ بقرہ کی آیت (۲۳۶) سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت ہوسکتی ہے کہ نکاح ہوجائے لیکن مہر مقرر نہ کیا جاسکا ہو۔ اس میں کہا گیا ہے کہ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً۔ (۲۳۶/۲)۔ "ایسی عورتوں کو (قانون کے مطابق) طلاق دینے میں کوئی ہرج نہیں جنہیں ابھی تم نے چھوا بھی نہیں یا جن کا ہنوز مہر مقرر نہیں ہوا تھا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے مہر بوقتِ نکاح مقرر نہ کیا جاسکا ہو، تو اسے بعد میں مقرر کیا جاسکتا ہے۔

(۴) مہر عورت کی ملکیت ہوتا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اسے اس سے محروم کردے۔ البتہ اگر عورت چاہے تو اپنی خوشی سے اس میں سے چھوڑ بھی سکتی ہے۔ سورۂ النساء میں ہے۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا۔ (۴/۴)

اور اپنی بیویوں کا مہر، کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر، اس طرح دے دیا کرو جس طرح شہد کی مکھی شہد دے دیتی ہے۔ (اس میں کسی قیمت یا بدل کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ اس لئے کہ مہر تو ایک تحفہ ہے نہ کہ کسی چیز کا بدلہ) ہاں! اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں، تو اسے بلا تأمل اپنے صرف میں لا سکتے ہو۔

اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے کہ باہمی رضامندی سے مقررشدہ مہر میں کمی بیشی بھی ہوسکتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ۔ (۲۴/۴)۔ "اس میں کوئی ہرج کی بات نہیں کہ مہر مقرر کرلینے کے بعد، تم (میاں بیوی) باہمی رضامندی سے (اس میں کمی بیشی کرلو)"۔

(۵) نکاح کے بعد، اگر قبل از خلوت طلاق واقع ہوجائے تو۔

ا۔ اگر مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو مرد کی وسعت کے مطابق عورت کو کچھ دیا جانا چاہیئے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:-

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً

وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۔ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۔ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (۲/۲۳۶) ۔ نیز (۳۳/۴۹)

اور اگر ایسی صورت ہو کہ تم نے ابھی اپنی منکوحہ بیوی کو چھوا نہیں اور نہ ہی اس کا مہر مقرر ہوا تھا اور طلاق کی نوبت آجائے تو، اس صورت میں بھی، قانون کے مطابق، طلاق دے دینے میں کچھ مضائقہ نہیں لیکن چاہیئے کہ اس مطلّقہ کو کچھ ساز و سامان دے دیا جائے۔ صاحبِ وسعت اپنی حیثیت کے مطابق، اور تنگدست اپنی بساط کے مطابق — تاکہ مطلّقہ ہونے کی وجہ سے، اُس عورت کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔ اِس قسم کا حسن کارانہ سلوک تم پر واجب ہے۔

(ب) اگر مہر مقرر ہو چکا تھا تو اس مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اگر عورت یا اس کا مختار کار چاہے، یا عدالتِ مجاز بعض حالات کے پیشِ نظر ضروری سمجھے تو اُسے چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۔ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (۲/۲۳۷)

اور اگر ایسا ہو کہ تم نے اپنی منکوحہ سے مقاربت نہیں کی، لیکن اُس کا مہر مقرر ہو چکا تھا، اور طلاق کی نوبت آ جائے تو اُس صورت میں اُس کے مہر کا نصف ادا کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر عورت چاہے تو اپنا حق چھوڑ بھی سکتی ہے۔ چاہے وہ خود ایسا کرے یا اس کا مختار کار جسے اس نے اپنے نکاح کا معاملہ سونپ رکھا ہو یا وہ عدالت جو ان معاملات کا فیصلہ کرے۔ اور اگر مرد نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے تو اور بھی اچھا ہے۔ اس قسم کا باہمی مراعات کا برتاؤ قانونِ خداوندی کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے تم آپس میں حسنِ سلوک کو کبھی نہ بھولو — الگ بھی ہو تو فراخدلی کا ثبوت دے کر الگ ہو۔ اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے۔

واضح رہے کہ آیت (۲/۲۳۷) میں جو کہا گیا ہے "اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ" (جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے)، تو اس سے عام طور پر مراد اس عورت کا خاوند لیا جاتا ہے۔ کیونکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ طلاق کا حق صرف مرد کو حاصل ہے عورت کو نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ مفہوم صحیح نہیں ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ قرآنِ کریم طلاق کا حق مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر دیتا ہے۔ اس آیت میں اَلَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے مراد عورت کا

مختار یا عدالت مجاز ہو سکتی ہے۔ (تفصیل طلاق کے عنوان میں ملے گی)۔

(۶) اگر عورت فحش کی مرتکب ہو تو اس کے مہر سے کچھ وضع کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ النسآء میں ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ (۴/۱۹)

اے جماعتِ مومنین! (جس طرح مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بیوی کا انتخاب اپنی مرضی سے کریں۔ ۴/۳) اسی طرح نکاح کے لئے عورتوں کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اگر وہ تمہارے نکاح میں نہ رہنا چاہیں تو انہیں اس نیت سے روکے رکھو کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ ہتھیا لو۔ ایسا قطعاً جائز نہیں، بجز اس کے کہ ان سے کھلی ہوئی بیحیائی کا ارتکاب ہوا ہو۔ (اس صورت میں عدالت تمہیں، اس میں سے کچھ دلا سکتی ہے۔)

ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ عدالت کی رُو سے ہو گا۔

(۷) اگر عورت طلاق کا مطالبہ کرے (اور عدالت ایسا ضروری سمجھے تو اسے اس کے لئے کچھ ادا کرنا ہوتا ہے (۲/۲۲۹)۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ مہر ہی کی رقم ہو۔ ہم نے احتیاطاً اس آیت کا اس مقام پر حوالہ دے دیا ہے۔ اس کا صحیح مقام طلاق کا عنوان ہے جہاں اس کی تشریح ملے گی۔

(نوٹ) لڑکی کو جہیز دینا محض ایک رسم ہے۔ قرآن کریم نے اس کا حکم کہیں نہیں دیا۔ لڑکے کی طرف سے جہیز کا مطالبہ بڑی زیادتی ہے۔ قرآن نے اُسے کچھ دینے کے لئے کہا ہے، لینے کے لئے نہیں۔

(۹) نان نفقہ

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، عورت کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ (۴/۳۴) اس لئے جب تک عورت مرد کے نکاح میں ہے، وہ اس کے "نان نفقہ" کا ذمہ دار ہے۔ اس میں رہائش بھی شامل ہے۔

(۲) مطلقہ عورت کی عدت کے دوران بھی اس کی ذمہ داری مرد پر ہوگی۔ (۲/۲۴۱ و ۶۵/۱ و ۶۵/۶)، بجز اس کے کہ عورت فحش کی مرتکب ہو (۶۵/۱)۔ تفصیل اس کی عدت کے عنوان میں ملے گی۔

نان نفقہ، مرد کے معیارِ زیست کے مطابق ہو گا۔ (۶۵/۷)

(۳) بیوہ عورت کے لئے ایک سال کے "نان نفقہ" کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ اسے چاہیئے کہ اس کے لئے

وصیت کر جائے۔ ہاں اگر عورت خود ہی کسی اور جگہ چلی جائے تو پھر اس کی ذمہ داری باقی نہیں رہتی (۲/۲۴۰)۔ تفصیل اس کی وراثت کے عنوان میں ملے گی۔

(۰)

(۱۰) تعلقات کی کشیدگی

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، نکاح سے مقصد باہمی محبت و سکینت سے رفاقت کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس کے لئے زوجین کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں تعلقات خوشگوار نہ رہیں۔ اس سلسلہ میں بعض ناخوشگواری محض عارضی ہوگی۔ اس کی عام وجہ سریع الغضب ہونا ہے۔ مثلاً انسان غصہ میں آکر بیہودہ باتیں بکنے لگتا ہے اور جہالت کی وجہ سے کبھی بیوی کو "ماں" کہہ دیتا ہے یا اس قسم کی کوئی اور بات۔ (اسے اصطلاح میں ظہار کہتے ہیں) اور غصہ ٹھنڈا ہو جانے پر اپنے کئے پر خود ہی نادم ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کی لغو باتوں اور قسموں کو حقیقت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ أَيْمَانِكُمْ وَلٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ..... (۲/۲۲۵)۔ "تمہاری لغو قسموں پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ مواخذہ ان قسموں پر ہوگا جن میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو" (نیز ۵/۸۹)۔ بیوی کو غصے کی حالت میں ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔي تُظٰهِرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهٰتِكُمْ (۳۳/۴)۔ "ظہار" سے بیوی ماں نہیں بن جاتی۔ لیکن چونکہ اس قسم کی بیہودہ حرکات سے گھر کی فضا مسموم ہو جاتی ہے اس لئے قرآن کریم اس کی روک تھام کے لئے، ایسی حرکات پر کچھ تاوان ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ایسی صورت میں زناشوئی کے تعلقات سے قبل۔

(۱) ایک غلام آزاد کیا جائے۔ (یہ حکم اس زمانے سے متعلق ہے جب عربوں کے معاشرہ میں غلام عام ہوا کرتے تھے) اگر غلام نہ ہوں تو

(۲) دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اور

(۳) جس میں اس کی طاقت نہ ہو وہ ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے۔

سورۃ المجادلہ میں ہے۔

وَالَّذِينَ يُظٰهِرُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَآسَّا ۚ ذٰلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۔ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۔ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا
ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (۵۸/۳-۴)

جو لوگ اپنی بیوی کو ماں دیا ایسے ہی کوئی اور الفاظ) کہہ بیٹھیں، اور اس کے بعد پشیمان ہو کر، اپنی اس بیہودہ بات کو واپس لینا چاہیں، (تو انہیں کچھ جرمانہ ادا کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنا سیکھیں اور یونہی جو جی میں آئے بک نہ دیا کریں۔ وہ جرمانہ یہ ہے کہ، قبل اس کے کہ وہ بہ حیثیت میاں بیوی ایک دوسرے کے پاس جائیں، ایک غلام آزاد کریں۔ یہ اس لئے ہے کہ تم آئندہ کے لئے نصیحت پکڑو۔ اور اللہ تمہارے تمام معاملات سے باخبر ہے۔

جس کے پاس غلام نہ ہو یا غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو (یا اُس زمانے کے غلاموں کے ختم ہو جانے کے بعد، جب غلام باقی ہی نہ رہیں تو) اس صورت میں، وہ، تعلقاتِ زناشوئی سے پہلے، دو ماہ کے متواتر روزے رکھے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لئے کہ تم اس نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھو جو اس کے رسولؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔

یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں جن کے اندر رہنا ضروری ہے۔ (اگر اس باب میں سہواً غلطی ہو جائے تو اس کے ازالہ کی شکل وہ کفارہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے ان حدود ہی کا انکار کریں، تو وہ کافر ہیں) اور کافروں کے لئے الم انگیز تباہی ہے۔

(۲) یہ تو رہا غصہ کی حالت میں بیہودہ قسموں کے متعلق۔ لیکن اگر کوئی شخص دل کے ارادے سے "بیوی کے پاس نہ جانے"، کی قسم کھالے (اسے اصطلاح میں اِیْلَاء کہتے ہیں) تو ایسی شکل کو دائماً قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اُسے چاہیئے کہ چار ماہ کے اندر اندر فیصلہ کرے کہ وہ تعلقاتِ زوجیت قائم رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۔ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔
وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۲۶-۲۲۷)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیں، تو عورت کو اِس معلّق حالت میں غیر متعین عرصہ کے لئے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اِس عرصہ میں باہمی تعلقات کی طرف رجوع کرلیں، تو انہیں اس کی اجازت ہے۔ کیونکہ قانونِ خداوندی میں اس قسم کی لغزشوں سے حفاظت اور رحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے (۵/۸۹ ؛ ۶۶/۲ ؛ ۲/۲۲۵)۔ یعنی قسم توڑنے کی طرح کفارہ ادا کریں۔

لیکن اگر وہ معاہدۂ نکاح سے آزاد ہو جانے کا فیصلہ کرلیں (جسے طلاق کہتے ہیں)، تو انہیں ایسا کرلینا چاہیئے۔

اس لئے کہ یہ اُس خدا کا قانون ہے جو ہر بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (اس سے معلوم ہے کہ جب
نباہ کی شکل باقی نہ رہے تو پھر الگ ہو جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔)

قرآن کریم کے اس حکم کی روشنی میں، اسلامی حکومت، ان لوگوں کے لئے جو بیویوں کو بساتے نہیں یا جو مفقود الخبر ہو جاتے ہیں، مناسب قوانین وضع کر سکتی ہے۔ مقصد قرآن کا یہ ہے کہ عورت کو کسی حالت میں بھی خاوند کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے۔ اس کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کی جائے۔

(۰)

(۱۱) طلاق

نکاح، بالغ، عاقل، مرد اور عورت کی کامل رضامندی سے، ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ ہے قرآن ایسی تعلیم دیتا ہے جس کی رو سے یہ معاہدہ بہ حسن و خوبی طے پاتے کیونکہ قوم کی عمرانی زندگی کا دارومدار، گھر کی خوشگوار فضا اور مساعد ماحول پر ہے۔ اسی سے آنے والی نسلوں کی صحیح تربیت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس سے میاں بیوی میں نباہ کا امکان باقی نہ رہے، تو اُس وقت قرآن، اس معاہدہ کو فسخ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسے طلاق کہتے ہیں (طلاق کے معنی ہیں، نکاح کے معاہدہ یا پابندی سے آزاد ہو جانا)۔ طلاق کے اس مفہوم کو اچھی طرح ذہن میں رکھیئے۔)

نکاح کے لئے تو اس نے اس معاملہ کو فریقین کی مرضی پر چھوڑا تھا کیونکہ یہ ان کا انفرادی مسئلہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ فسخ نکاح کا معاملہ انفرادی نہیں رہتا۔ اس میں فریقِ مقابل کے، نیز بعض اوقات ان کی اولاد کے مفادات پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے اُسے، اُس نے معاشرہ کا اجتماعی مسئلہ قرار دیا ہے، اور اس سلسلہ میں معاشرہ کو ضروری ہدایات دی ہیں۔ اس ضمن میں ایک اصولی بات واضح ہے اور وہ یہ کہ جب اس معاہدہ کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری تھی تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اس معاہدہ کو توڑنے کے لئے، ایک طرف ایک فریق (خاوند) کو کلی اختیار دے دیا جائے (کہ وہ جب جی چاہے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر) بیوی کو گھر سے نکال دے۔ اور دوسری طرف، فریق ثانی (بیوی) کو اس قدر مجبور بنا دیا جائے کہ اُسے اس پابندی سے گلوخلاصی کے لئے ہزار مشقتیں اٹھانی پڑیں۔ قرآن نے میاں اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں مقرر کی ہیں۔ اس لئے اس باب میں بھی دونوں کی پوزیشن ایک جیسی ہے۔ اب دیکھیئے کہ وہ اس سلسلہ میں معاشرہ کو کیا ہدایات دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۔ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۔ (۴/۳۵)

اگر تمھیں کسی میاں بیوی میں ناچاقی کا خدشہ ہو تو ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے مقرر کرو۔ اس طرح، اگر میاں بیوی باہمی مصالحت کا ارادہ کرلیں (یا یہ دونوں ثالث ان میں اصلاح کی نیت سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں)، تو قانونِ خداوندی، ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اس لئے کہ اس کا قانون علم و آگہی پر مبنی ہے۔

"شِقَاقَ بَيْنِهِمَا" میں مرد اور عورت دونوں آجاتے ہیں۔ یعنی اس باہمی اختلاف کی شکایت مرد کرے یا عورت، دونوں صورتوں میں معاشرہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ ثالثی بورڈ مقرر کرے۔

اگر عورت خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رُخی محسوس کرے تو اس صورت میں بھی وہ خود صلح صفائی کی کوشش کریں، یا پھر ثالثی بورڈ مقرر کرالیں۔ اسی سورہ میں آگے چل کر کہا۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۔ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۔ (۴/۱۲۸)

اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی ہرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح صفائی کرلیں۔ (اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر مندرجہ بالا قاعدے کے مطابق، ثالثی بورڈ مقرر کرالیں)، صلح بہرحال اچھی چیز ہے۔

سورۂ مجادلہ میں ہے:-

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِىْ تُجَادِلُكَ فِىْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِىْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۔ (۵۸/۱)

اللہ نے اس عورت کی بات سُن لی ہے جو تجھ سے (اے رسولؐ!) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اپنی مظلومیت کے متعلق خدا سے فریاد کر رہی تھی (اُس نے عدالتِ خداوندی میں استغاثہ دائر کیا تھا۔ اللہ تم دونوں کے سوال و جواب سُن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے"۔

اس سے بھی واضح ہے کہ عورت اپنا کیس (مقدمہ) لے کر عدالت میں جاسکتی ہے۔ یعنی عورت کو بھی (قانون کے مطابق) طلاق لے لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن ثالثی بورڈ کی اولین کوشش میاں بیوی میں مصالحت کی ہوگی۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے میاں اور بیوی دونوں کے سلسلہ میں طلاق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ خُلع کی اصطلاح قرآن میں نہیں آئی۔ نیز یہ جو کہا جاتا ہے کہ "خاوند نے بیوی کو حقِ طلاق تفویض کر دیا ہے" قرآن مجید کی رو سے صحیح نہیں۔ جب بیوی کو بھی طلاق (فسخِ نکاح) کا ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا میاں کو تو پھر خاوند کی طرف سے حقِ طلاق تفویض کرنے کے کیا معنی؟

اگر اس طرح مصالحت نہ ہو سکے تو جس ادارہ (عدالت) نے اس ثالثی بورڈ کا تقرر کیا تھا وہ فسخِ نکاح کا اعلان کرے۔ اسے طلاق کہا جائے گا۔ سورۃ الطلاق میں ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ . (۶۵/۱)

اے رسولؐ! جب تم طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرو تو متعلقہ لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے بعد عدّت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے ضرور پورا کرنا چاہیئے۔

اس آیت میں مخاطب النبی کو کیا گیا ہے اور کہا یہ گیا ہے کہ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ: "جب تم عورتوں کو طلاق دو" اس میں (طلّقتم) جمع کا صیغہ ہے جس سے واضح ہے کہ یہاں سوال، رسولؐ اللہ کا اپنی کسی بیوی کو طلاق دینے کا نہیں۔ (ویسے بھی رسولؐ اللہ کی کسی بیوی کے سلسلہ میں طلاق کا سوال پیدا ہی نہیں ہوا تھا)۔ اس میں رسولؐ اللہ کو بحیثیت 'عدالت' مخاطب کیا گیا ہے۔ یعنی جب وہ (بحیثیتِ عدالت) طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کریں تو یوں کریں۔ ۔ ۔ ۔

اس سے واضح ہے کہ طلاق کا مسئلہ انفرادی نہیں کہ جب کسی کا جی چاہا، بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کا فیصلہ عدالتِ مجاز کی طرف سے ہوگا۔ وہ پہلے مصالحتی بورڈ قائم کرے گی اور اگر مصالحت کی کوشش ناکام رہ جائیگی، تو پھر طلاق کا فیصلہ کرے گی۔

چونکہ عدّت کا تعین (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) حیض کی نسبت سے ہوتا ہے، اس لئے شمارِ عدت میں آسانی کے لئے، طلاق کے فیصلے کا نفاذ، عورت کے ایّام سے فارغ ہو جانے کے بعد ہونا چاہیئے۔ مندرجہ بالا آیت (۶۵/۱) میں، لِعِدَّتِهِنَّ کے بعد "وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ" آیا ہے۔ (یعنی عدّت کا شمار کیا جائے گا) عدالت اپنے فیصلے میں اس کی تصریح کر دے۔

اگر عدالتِ مجاز یہ دیکھے کہ مرد نباہ نہیں کرنا چاہتا تو وہ عورت سے کچھ لئے بغیر، طلاق کا فیصلہ کر دے گی۔ سورۃ النساء میں ہے:۔

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا

مِنْهُ شَيْئًا ۔ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۔ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۔ (۴ / ۲۰-۲۱)

اور اگر تم یہ فیصلہ کر لو کہ ایک بیوی کو طلاق دے کر، کسی اور جگہ نکاح کرنا ہے — اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض نئی عورت سے شادی کرنے کا شوق، طلاق کے لئے وجہ جواز ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر، اُن شرائط کے مطابق، جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا، طلاق تک کی نوبت پہنچ جاتے — اور تم اپنی بیوی کو سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہو، تو اس سے کچھ واپس نہ لو۔ (البتہ اگر طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہو تو پھر اس میں سے کچھ لیا جا سکتا ہے، (۲ / ۲۲۹) یا اگر اس سے بے حیائی کا ارتکاب ہوا ہو، تو ۴ / ۱۹)۔ لیکن جب ایسی صورت نہ ہو، اور تم اس (بچاری) کے خلاف ناحق تہمتیں لگا کر کچھ وصول کرنا چاہو، تو یہ ایک کھلا ہوا گناہ ہے — یعنی ایسی معیوب حرکت جس کے مذموم ہونے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

جو کچھ تم نے اُسے دیا تھا وہ کیسے واپس لے سکتے ہو، درآں حالیکہ تم میں زناشوئی کے تعلقات رہ چکے ہیں اور تمہاری بیویاں نکاح کے وقت تم سے اپنے حقوق کے تحفظ کا پورا عہد لے چکی ہیں۔ لہٰذا، تمہارے لئے اس معاہدہ کا احترام ضروری ہے۔

لیکن عورت اگر فحش کی مرتکب ہو تو

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۔ (۴ / ۱۹)

تمہارے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اگر وہ تمہارے نکاح میں نہ رہنا چاہیں تو انہیں اس نیت سے روک رکھو کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو، اس میں سے کچھ ہتیا لو، بجز اس کے کہ ان سے کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب ہوا ہو۔

یا وہ خود نباہ نہ کرنا چاہے، تو عدالت عورت سے کچھ ہرجانہ دلا سکتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے:۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۔ (۲ / ۲۲۹)

طلاق کی صورت میں اس کی اجازت نہیں کہ جو کچھ تم عورتوں کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ بھی واپس لے لو۔

ہاں اگر کسی وقت ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ایک طرف یہی چیز اُن کی علیحدگی کے راستے میں حائل ہو رہی ہو، اور، دوسری طرف، میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے میں انہیں خدشہ ہو کہ (تعلقات کی کشیدگی کی بنا پر) وہ حقوق و واجبات ادا نہیں کر سکیں گے جو قانونِ خداوندی نے ان پر عائد کر رکھے ہیں — اور معاشرہ کا نظامِ عدالت بھی اسی نتیجہ پر پہنچے اور سمجھے کہ خاوند کو واقعی کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور معاہدۂ نکاح سے آزادی حاصل کرلے۔

ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں کہ عورت بدنیتی سے نکاح کرکے مہر وصول کرلے اور اس کے بعد طلاق حاصل کرنے کی طرف قدم اٹھائے، تو مہر میں سے کچھ واپسی، ایسے اقدامات کی روک تھام کے لئے ممد ثابت ہوگی۔

عدالت کے اس فیصلہ یا اعلان کے بعد عورت کے لئے عدّت کی میعاد شروع ہو جائے گی۔ عدّت اُس مدّت کو کہتے ہیں جس کے اندر عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔ (اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی)۔ اسے انتظار کا وقفہ کہیئے۔ اس مدّت میں عورت وہیں رہے گی اور اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی اس کے (سابقہ) شوہر پر ہوگی۔ (تفصیل عدّت کے عنوان میں ملے گی)۔ اس سلسلہ میں قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ غور طلب ہے۔

سورۃ الطلاق میں ہے:-

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۔ (٦٥/٢)

جب وہ مدّت ختم ہونے کو ہو تو انہیں یا تو "معروف" طور پر رکھ لو۔ یا معروف طور پر الگ کر دو۔

سورۃ بقرہ میں ہے۔ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط (٢/٢٢٩)۔ اس کے بعد یا تو انہیں معروف طور پر روک لو۔ یا احسان کے ساتھ رخصت کر دو۔ (نیز ٢/٢٣١)۔ تیسری جگہ ہے۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ط (٢/٢٢٨)۔ "ان کے خاوند اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ انہیں واپس لے لیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ عدّت کے دوران، انہیں رشتۂ ازدواج کی استواری کا موقعہ دیا گیا ہے۔ اس کے لئے دو باتیں واضح ہیں۔

(١) اگر طلاق بیوی نے حاصل کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس خاوند کے ہاں بسنا نہیں چاہتی۔ اس لئے خاوند اسے مجبوراً دوبارہ اپنے ہاں نہیں لے جا سکتا۔ ہاں! اگر یہ عورت خود ہی اپنا ارادہ بدل لے تو اور بات ہے۔

(٢) اگر طلاق خاوند نے حاصل کی ہے، حالانکہ عورت اس کے ہاں بسنا چاہتی تھی تو اگر مرد اپنی اصلاح کا

ارادہ کرلیتا ہے تو یہ رشتہ استوار ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ دیکھنا! ایسا کرنے میں کہیں نیت نہ رکھنا کہ دوبارہ زوجیت میں لے کر عورت کو تنگ کیا جائے۔ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۔(۲/۲۳۱) "ان سے ازدواجی تعلقات اس نیت سے وابستہ نہ کرو کہ اُن پر زیادتی کرکے انہیں تکلیف پہنچائی جائے۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا"۔

اب اگلی بات یہ ہے کہ اس رشتہ کی استواری کے لئے معاہدۂ نکاح کی تجدید کی ضرورت ہوگی یا سابقہ معاہدہ ہی برقرار سمجھا جائے گا۔ اس کے لئے قرآن نے " بالمعروف " کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ "معروف" کے معنی ہیں وہ طریق جسے اسلامی معاشرہ، قرآنی راہ نمائی کی روشنی میں صحیح تسلیم (RECOGNISE) کرلے۔ لہٰذا، اگر معاشرہ اسے تسلیم کرلے کہ اس کے لئے از سرِ نو نکاح کرنے کی ضرورت نہیں تو یہ بھی درست ہوگا اور اگر یہ فیصلہ کرے کہ نہیں! اس کے لئے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا تو یہ بھی صحیح ہوگا۔ "نکاح" بھی اس سے زیادہ کیا ہے کہ معاشرہ، میاں بیوی کی رضامندی کو (قرآن کے مطابق) صحیح تسلیم کرلے اسے (RECOGNISE) کرے۔ البتہ (۲/۲۳۲) میں قرآن نے "نکاح" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جہاں کہا ہے۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ...... (۲/۲۳۲) "جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدّت کی مدّت کے قریب پہنچ جائیں۔ اور یہ (سابقہ میاں بیوی) قاعدے اور قانون کے مطابق پھر ازدواجی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں تو (اے افرادِ معاشرہ)، تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو"۔ یہاں بھی " بالمعروف " کہا گیا ہے۔ یعنی اس قاعدے کے مطابق جسے نظامِ مملکت مقرر کرے۔ بنابریں، حکومت کو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عدّت کے دوران رشتۂ ازدواج کی تجدید ایسے طریق سے ہو جسے "نکاح" سمجھا جاسکے۔

اگر انہوں نے پھر سے میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کا فیصلہ کیا ہے تو طریق بالا کارفرما ہوگا۔ اگر الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا ہے تو اس کے لئے دو گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سورۃ الطّلاق میں ہے۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۔۔۔۔ (۶۵/۲)

جب عدّت کا زمانہ ختم ہونے کو آئے تو اس وقت اس معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ اگر نباہ کی صورت ممکن دکھائی دے تو خواہ علیحدگی کیوں اختیار کرو۔ قاعدے اور قانون کے مطابق میاں بیوی کی زندگی بسر کرو۔ لیکن اگر نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو پھر، قاعدے اور قانون کے مطابق علیحدہ ہو جاؤ اور اس آخری

فیصلہ پر اپنے میں سے دو گواہ مقرر کر لو جو کسی کی رُو رعایت نہ کریں، اور اسے فریضۂ خداوندی سمجھ کر حق و انصاف سے گواہی پر قائم رہیں۔

اس کے بعد، وہ رعایت ختم ہو جائے گی جو عدّت کے دوران انہیں حاصل تھی۔

یہ میاں بیوی، خواہ عدّت کے دوران پھر سے رشتہ استوار کرلیں اور خواہ الگ ہو جائیں۔ یہ ایک طلاق بہرحال محسوب ہو جائے گی۔

اگر اس جوڑے نے (عدّت کے دوران یا اس کے بعد) میاں بیوی کی حیثیت اختیار کرلی لیکن اس کے بعد پھر سے طلاق کی نوبت آگئی تو اس کے لئے وہی کچھ کرنا ہوگا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہو جائے گی۔

اگر انہوں نے اس (دوسری طلاق) کے بعد، پھر سے اس رشتہ کو استوار کرلیا لیکن اس کے بعد پھر طلاق کی نوبت آگئی تو یہ تیسری طلاق ہوگی۔ اس طلاق کے بعد، یہ (نہ عدّت کے دوران۔ نہ اس کے بعد) میاں بیوی بن سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹) ایک مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ کی طلاق کے بعد تو اس کی اجازت ہے کہ وہ پھر سے میاں بیوی بن جائیں۔ لیکن اس کے بعد (یعنی تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد) اس کی اجازت نہیں۔

ہاں! اگر تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد، عورت کہیں دوسری جگہ شادی کرلے اور وہاں بھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نوبت طلاق کی آجائے (یا وہ بیوہ ہو جائے)، تو پھر یہ اگر چاہے تو اپنے پہلے خاوند سے از سرِ نو نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیات ۲۳۰ ؛ ۲۲۹ میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ انہیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۔ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۳۰-۲۲۹)

یاد رکھو! ایک مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ طلاق کے بعد، عدّت کے دوران میں یا اس کے بعد، پھر سے قانون کے مطابق آپس میں نکاح کر لیں، یا حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جائیں (لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آجائے، تو اس کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ ۲/۲۳۰)۔ طلاق کی صورت میں اس کی اجازت نہیں کہ جو کچھ تم عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لے لو۔ ہاں اگر کسی وقت ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ایک طرف یہی چیز اُن کی علیحدگی کے راستے میں حائل ہو رہی ہو اور دوسری طرف میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے میں انہیں خدشہ ہو کہ (تعلقات کی کشیدگی کی بنا پر) وہ حقوق و واجبات ادا نہیں کر سکیں گے جو قانونِ خداوندی نے اُن پر عاید کر رکھے ہیں ــــ اور معاشرہ کا نظامِ عدل بھی اسی نتیجہ پر پہنچے اور سمجھے کہ خاوند کو واقعی کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور معاہدۂ نکاح سے آزادی حاصل کر لے۔

یہ قانونِ خداوندی کی حدود ہیں جن کی نگہداشت ضروری ہے۔ جو کوئی ان حدود سے تجاوز کرے گا وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہوگا۔

اگر کسی میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ کی طلاق (اور نکاحِ اول کو شامل کر کے تین مرتبہ کے نکاح) کے بعد تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے، تو اس کے بعد یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ ہاں! البتہ اگر وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور اس سے بھی طلاق ہو جائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرلے، بشرطیکہ انہیں توقع ہو کہ وہ اب قانونِ خداوندی کی حدود کی نگہداشت کر سکیں گے۔

یہ ہیں عائلی زندگی سے متعلق وہ قوانین جنہیں اللہ ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے جو معاشرتی زندگی کی مصلحتوں کا علم رکھتے ہیں۔

یہ ہیں وہ آیات جنہیں تائید میں پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی نے تین مرتبہ کہہ دیا۔ "طلاق۔ طلاق، طلاق" تو پھر حلالہ کرنا پڑے گا۔ ان آیات کا یہ مفہوم خلافِ قرآن ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، طلاق کے معنی ہیں عقدِ نکاح سے آزاد ہو جانا۔ نکاح کا فسخ (ختم) ہو جانا۔ فسخِ نکاح اس طریق کے مطابق ہوتا ہے جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔ طلاق کا لفظ کہہ دینے سے نکاح فسخ نہیں ہو جاتا خواہ اسے تین چھوڑ تین سو مرتبہ بھی کیوں نہ دہرایا جائے۔ تین طلاق کے معنی ہیں ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں تین مرتبہ نکاح کا فسخ ہو جانا۔ دو مرتبہ فسخِ نکاح کے بعد اس کی گنجائش رہتی ہے کہ وہ باہمی میاں بیوی بن سکیں۔ لیکن تیسری مرتبہ فسخ نکاح کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی، بجز اس صورت کے جس کا ذکر

اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس صورت میں بھی "دوسرے شخص سے نکاح" کے معنی شب بسری (حلالہ) نہیں۔ اس سے مراد باقاعدہ میاں بیوی کی زندگی بسر کرنا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مہر، نکاح کے وقت ادا ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اگر عورت نے اس کی وصولی کو ملتوی کر دیا تھا تو طلاق سے چونکہ معاہدہ نکاح فسخ ہو جاتا ہے اس لئے اس وقت مہر کی ادائیگی ضروری ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں مہر کا عنوان دیکھئے جس میں اس کی بابت تفصیلات دی جا چکی ہیں۔

---

(۱۴) عدت

عدت اس مدت کا نام ہے جس میں مطلقہ (یا بیوہ عورت) کسی دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی۔ اس سے درحقیقت مقصد یہ ہے کہ اس بات کا یقینی طور پر تعین ہو جائے کہ اگر عورت حمل سے ہے تو ہونے والا بچہ، اس کے سابقہ شوہر کی جائز اولاد ہے۔ مرد کے لئے عدت نہیں قرآن نے جہاں کہا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۔ (۲/۲۲۸) "عورت کے اتنے ہی حقوق ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔ لیکن مردوں کو ایک فوقیت حاصل ہے" وہ فوقیت یہ ہے کہ مرد کے لئے عدت نہیں۔ وہ طلاق کے فوری بعد دوسری جگہ شادی کر سکتا ہے۔

(۲) مطلقہ عورت کی عدت تین حیض (ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ) ہے (۲/۲۲۸)۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ طلاق اس وقت دی جائے جب عورت حیض سے فارغ ہو جائے، تو اس سے مقصد یہی ہے کہ عدت کے شمار کرنے میں تیقّن ہو (۶۵/۱)

(۳) جو عورتیں اتنی سن رسیدہ ہو چکی ہوں کہ وہ حیض کی طرف سے ناامید ہوں۔ یا جنہیں کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، ان کی عدت تین مہینے ہوگی۔

وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّ الّٰٓئِيْ لَمْ يَحِضْنَ ۔ (۶۵/۴)

(جیسا کہ ۲/۲۲۸ میں بتایا جا چکا ہے، عدت کی مدت عام حالات میں تین حیض کا زمانہ ہے لیکن) جن عورتوں کو حیض آنا بند ہو چکا ہو (وہ حیض کی طرف سے مایوس ہو چکی ہوں) اور اس وجہ سے یہ دشواری لاحق ہو کہ ان کی عدت کا شمار کس طرح کیا جائے تو ان کے لئے تین حیض کے بجائے تین مہینے، عدت کے شمار کر و۔ یہی عدت ان عورتوں کے ضمن

میں شمار کرو جنہیں، کسی عارضہ کی وجہ سے، حیض نہ آسکا ہو۔

(۴) حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ (۶۵/۴) ''جو عورتیں حمل سے ہوں، ان کی عدت وضع حمل تک ہے۔'' انہیں چاہیئے کہ طلاق کے وقت بتا دیں کہ وہ حمل سے ہیں۔ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ ۔ (۲/۲۲۸)۔ ''ان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں تخلیق کیا ہے، اسے چھپائیں۔''

(۵) جس عورت کو ''ہاتھ لگانے'' سے قبل طلاق دے دی گئی ہو اس کے لئے کوئی عدت نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۔ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۔ (۳۳/۴۹)

اے جماعتِ مومنین! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں (قانون کے مطابق) طلاق دے دو۔ قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو، تو تمہارے لئے ضروری نہیں کہ تم ان کی عدت کا شمار کرو جس میں ان کا نان ونفقہ تمہارے ذمہ ہوتا ہے اور جس میں وہ دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتیں، تم انہیں مناسب سامان دے کر، نہایت خوشگوار انداز سے رخصت کر دو۔ (نکاح ایک معاہدہ ہے۔ جب دیکھا جائے کہ وہ معاہدہ نبھ نہیں سکتا تو قاعدے اور قانون کے مطابق اسے فسخ کر دیا جائے۔ اس میں تلخی پیدا ہونے کی کون سی بات ہے؟ (۲/۲۲۸-۲۳۰؛ ۶۵/۱-۴)

(۶) بیوہ عورت کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۔ (۲/۲۳۴)۔

تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنے پیچھے اپنی بیوہ چھوڑ جائیں تو انہیں چار ماہ اور دس دن تک (نکاحِ ثانی کے لئے) انتظار کرنا چاہیئے۔ جب ان کی عدت ختم ہونے کو آئے، تو وہ اپنے لئے قاعدے اور قانون کے مطابق جو فیصلہ بھی کرنا چاہیں، انہیں اس کا اختیار ہے۔ تم پر اس بارے میں کوئی الزام نہیں ہوگا (کہ انہوں نے یوں کیوں کیا اور یوں کیوں نہ کیا)۔ یاد رکھو! جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔

اگر وہ حاملہ ہے تو اس کے لئے قرآن میں عدت کا الگ حکم نہیں آیا۔ لیکن مطلقہ (حاملہ) کے متعلق حکم پر قیاس کر کے مستنبط کیا جاسکتا ہے کہ اس کی عدت بھی وضع حمل تک ہوگی۔

(۷) عدت کے دوران، مطلقہ عورت کے رہنے سہنے اور خورونوش کی ذمہ داری مرد پر ہوگی اور اس کا وہی معیار

ہوگا جو ازدواجی حالت میں تھا۔ سورہ الطلاق میں ہے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۔ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۔ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۔ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۔ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۔ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۔ (۶۵/۶-۷) نیز (۲/۲۳۳)

تم ان مطلقہ عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو، اور اسی طرح رکھو جس طرح تم خود رہتے ہو۔ اور انہیں تنگ کرنے کی غرض سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اور اگر وہ حمل سے ہیں تو وضعِ حمل تک تو تمہیں ان کا خرچ بہرحال برداشت کرنا ہے۔ اگر وضعِ حمل کے بعد وہ تمہاری خاطر بچے کو دودھ پلائیں (یعنی تم کوئی اور انتظام نہ کرو اور باہمی رضامندی سے یہ طے پا جائے کہ وہی بچے کو دودھ پلائیں۔ تو) انہیں ان کی دودھ پلائی کی اُجرت دو۔ ان امور کی تفاصیل کو باہمی مشورے سے قاعدے قانون کے مطابق، طے کر لیا کرو۔ اور اگر تم میں سے کسی پر یہ انتظام گراں گزرے تو تم کسی دوسری عورت کا انتظام کر لو جو بچے کو دودھ پلائے۔

مطلقہ کا خرچ، یا دودھ پلانے کی اجرت کا معاملہ طے کرنے کے سلسلہ میں اس بات کو مدِنظر رکھو کہ صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق خرچ دے اور جس کا ہاتھ تنگ ہو، تو جو کچھ اللہ نے اسے دے رکھا ہے وہ اس کے مطابق دے۔ یاد رکھو! خدا کا قانون کسی پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اگر اس فالتو خرچ سے اس پر کچھ تنگی آ جائے تو قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کی اس تنگی کو آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔ (عدالتِ مجاز اس بات کا بھی خیال رکھے۔)

لیکن اگر یہ اس دوران میں کسی بے حیائی کی مرتکب ہو تو پھر اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۔ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔ (۶۵/۱)

اے رسولؐ! جب تم طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرو تو لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے بعد عدت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضرور پورا کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اس کا حساب رکھو، اور اس طرح اپنے نشوونما دینے

والے کے احکام کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ (۲/۲۲۸-۳۲) (۳۳/۴۹)۔ اور اس دوران میں ان مطلقہ بیویوں کو ان کے گھروں سے مت نکالو (۶۵/۱)۔ (عدت کے دوران یہ گھر ہنوز ان کے اپنے گھر ہیں۔ اس لئے نہ تم انہیں ان گھروں سے نکالو) نہ وہ خود ہی (بلا عذر) وہاں سے نکلیں۔ ہاں، اگر وہ کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوں (تو پھر ان کو گھر سے نکالا جا سکتا ہے)، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود (قوانین) ہیں۔ جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتا ہے تو (اس سے جو نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے وہ تو ایک طرف رہا) وہ خود اپنے آپ پر بھی زیادتی کرتا ہے۔

جیساکہ اوپر کی آیت میں کہا گیا ہے، عورت کو بھی چاہیئے کہ عدت کے دوران اس گھر سے کسی اور جگہ نہ چلی جائے۔ لیکن اگر حالات نامساعد ہوں جن کی وجہ سے وہاں رہنا ٹھیک نہ ہو تو عدالتِ مجاز کی اجازت سے وہ دوسری جگہ بھی رہ سکتی ہے۔ یہ ہمارا استنباط ہے قرآن مجید کی اس آیت سے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔ (۴/۱۳۰) مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں مصالحت کی شکل پیدا نہ ہو سکے اور وہ علیحدہ ہو جائیں تو اللہ ان کی ضروریات بہم پہنچانے کا انتظام کر دے گا۔ یعنی اس کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوگی۔

(۸) بیوہ عورت کے لئے ایک سال تک کی رہائش اور خور و نوش کا انتظام ضروری ہے جس کے لئے چاہیئے کہ مرد وصیت کر جائے۔ اگر وہ (عورت) اس سے پہلے اپنی مرضی سے کسی اور جگہ چلی جائے تو پھر یہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲/۲۴۰)

تم میں سے جو لوگ بیوہ عورتیں چھوڑ کر مر جائیں انہیں چاہیئے کہ اپنی بیویوں کے متعلق وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک انہیں گھر سے نہ نکالا جائے اور انہیں سامانِ زندگی دیا جاتے۔ لیکن اگر وہ از خود چلی جائیں اور قاعدے قانون کے مطابق، اپنے لئے کچھ اور فیصلہ کرلیں، تو اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آتا۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون بڑی قوت والا، لیکن، اس کے ساتھ ہی حکمت پر مبنی بھی ہے۔

(۹) عدت کے دوران بیوہ عورت نکاح تو نہیں کر سکتی لیکن نکاح کے لئے سلسلہ جنبانی کی ممانعت نہیں۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ (۲/۲۳۵)

اِن عورتوں کی عدّت کے دوران، اگر تم اِن سے نکاح کی بابت کچھ اشارۃً کنایۃً کہہ دو، یا اپنے دل میں اس کا ارادہ پوشیدہ رکھو، تم اس میں کوئی مضائقہ نہیں — خدا کو اس کا علم ہے کہ تمہیں ان سے نکاح کرنے کا خیال آئے گا — لیکن ان سے خفیہ خفیہ نکاح کا وعدہ مت لے لو۔ ہاں! جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قاعدے قانون کے مطابق ان سے بات چیت کرو۔ لیکن عدّت کے دوران میں نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ ظاہرا اعمال تو ایک طرف، خدا تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے — اور یہ بھی سمجھ لو کہ ان حدود و قیود سے، خدا تم پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تمہارا معاشرہ غلط روی کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ خدا ایسا نہیں کہ وہ تمہاری غلط روی پر بھڑک اٹھے اور تمہیں سخت قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دے — ایسا کچھ، مستبد حکمران کیا کرتے ہیں۔ خدا ایسا نہیں کرتا۔

اگر وہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرنا چاہے (عدّت کے دوران یا اس بعد) تو اس کے راستے میں روڑے نہیں اٹکانے چاہئیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (۲/۲۳۲)

"جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں اور سابقہ میاں بیوی، قاعدے اور قانون کے مطابق پھر ازدواجی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں تو تم انہیں اس سے مت روکو۔"

(۱۳) رضاعت (بچے کو دودھ پلانا)

قرآنِ کریم نے یہ حکم نہیں دیا کہ ماں اپنے بچے کو اتنی مدت تک ضرور دودھ پلائے۔ اس کا فیصلہ تو بچے کی حالت کے مطابق خود ماں باپ کر سکتے ہیں۔ ویسے عام طور پر قرآن نے کہا ہے کہ بچے کی ماں پہلے جنین کو اپنے رحم میں رکھتی ہے اور پھر اسے دودھ پلاتی ہے تو اس میں اس کے اڑھائی برس صرف ہو جاتے ہیں۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا. حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا۔ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا۔ (۴۶/۱۵)

ہم نے انسان سے تاکیداً کہا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آئے (حیوانات میں، ماں باپ بچے کی پرورش تو کرتے ہیں لیکن بچہ بڑا ہو کر، اپنے ماں باپ کو پہچانتا تک نہیں۔ اسی لئے انسان سے یہ کہنا پڑا کہ وہ حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرے جس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اپنے ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آئے)، اس کی ماں نے حمل اور پھر وضعِ حمل کی تکلیف کو برداشت کیا (اور اسے پالنے کے سلسلے میں دن کا چین اور رات کی نیند اپنے اوپر حرام کر لی اور یہ کوئی ایک آدھ دن کی بات نہیں تھی)۔ حمل اور دودھ پلانے کا عرصہ کم از کم تیس ماہ میں جا کر پورا ہوتا ہے۔ (۳/۴۶؛ ۳۱/۱۴)۔

دوسری جگہ دودھ پلانے کا عرصہ دو سال بھی آیا ہے — وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (۳۱/۱۴)

(۲) جب کوئی عورت عقدِ نکاح سے آزاد ہو جائے اور اس کی گود میں بچہ ہو تو اس سلسلہ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ:۔

۱۔ بچے کا باپ، رضاعت کی اجرت، بچے کی ماں کو دے۔

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۔ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ (۶۵/۶)۔

اگر وضعِ حمل کے بعد، وہ تمہاری خاطر بچے کو دودھ پلائیں (یعنی تم کوئی اور انتظام نہ کرو اور باہمی رضامندی سے یہ طے پا جائے کہ وہی بچے کو دودھ پلائیں تو) انہیں ان کی دودھ پلائی کی اجرت دو۔ ان امور کی تفاصیل کو باہمی مشورے سے، قاعدے قانون کے مطابق طے کر لیا کرو (اور اگر تم میں کسی پر یہ انتظام گراں گزرے تو تم کسی دوسری عورت کا انتظام کر لو جو بچے کو دودھ پلائے۔

۲۔ اس طرح دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ لیکن اگر وہ باہمی رضامندی اور مشاورت سے اس سے کم عرصہ میں بھی دودھ چھڑا دینا چاہیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

رضاعت کے عرصہ کے لئے اس عورت کے خورد و نوش اور کپڑوں کے اخراجات بچے کے باپ کے ذمہ ہونگے اس کا معیار، اس مرد کی استطاعت کے مطابق ہوگا۔ اس سلسلہ میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس بچے کی وجہ سے نہ تو باپ کو ناحق تکلیف اٹھانی پڑے۔ نہ ہی اس کی ماں کو۔ اگر بچے کی ماں کے بجائے، کسی اور عورت سے دودھ پلانا مناسب

سمجھا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔
وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔
لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ فَاِنْ
اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ
اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (۲/۲۳۳)

اگر طلاق کی صورت میں، ماں کی آغوش میں دودھ پیتا بچہ ہو، اور باپ چاہے کہ وہ اس بچے کو پوری مدت تک دودھ پلائے، تو ماں کو چاہیئے کہ وہ پورے دو سال تک بچے کو دودھ پلائے (۳۱/۱۴ ; ۴۶/۱۵)۔ اس صورت میں قاعدے اور قانون کے مطابق، اُس عورت کے روٹی کپڑے کا انتظام، اس مرد کے ذمے ہوگا۔ یہ انتظام اس مرد کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس باب میں اصول یہ ہے کہ کسی شخص پر اُس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ (فیصلہ کرنے والی عدالت کو چاہیئے کہ اس چیز کو پیشِ نظر رکھے کہ) نہ تو اس بچے کی وجہ سے ماں کو ناحق تکلیف پہنچے اور نہ ہی اس کے باپ کو۔ اگر اُس بچہ کا باپ (اس اثنا میں) فوت ہو جائے تو اس کی ذمہ داری اُس کے وارث کے سر پر ہوگی۔

اگر وہ دونوں، باہمی رضامندی اور مشورہ سے، (قبل از وقت) دودھ چھڑا کر کوئی اور انتظام کرلینا چاہیں) تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تم بچہ کے لئے کوئی اور دودھ پلانے والی کا انتظام کرنا چاہو تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں، بشرطیکہ جو کچھ تم نے بچے کی ماں سے طے کیا تھا وہ اسے پورا پورا دیدو۔

بہرحال، تم ہمیشہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل اور نیت پر نگاہ رکھتا ہے۔ (اس لئے نہ تو قانون کی محض رسمی پابندی کرو اور نہ ہی اس سے گریز کی راہیں تلاش کرو۔)

(۱۴) حضانت

ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں نابالغ بچے کس کی تحویل میں رہیں، اس کی بابت قرآن کریم نے کوئی حکم

نہیں دیا۔ اس کا فیصلہ' عدالتِ مجاز متعلقہ حالات کے پیشِ نظر کر سکتی ہے۔ اس باب میں اصول پیشِ نظر یہ ہونا چاہیئے کہ بچوں کی وجہ سے نہ تو باپ کو ناحق مشقت اٹھانی پڑے اور نہ ہی ماں کو اذیت۔ یہ اصول آیت (۲/۲۳۳) کی روشنی میں وضع کیا جا سکتا ہے جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ اس مقصد (نیز بلوغت کی عمر تک پہنچنے کے سلسلہ میں اخراجات کی ذمہ داری) کے متعلق' اسلامی حکومت خود قوانین وضع کرے گی۔

(٠)

(۱۵) اولاد

باہمی رفاقت کے علاوہ عائلی زندگی کا بنیادی مقصد انسانی برادری میں صحیح اضافے کرنا ہے۔ نسل میں اضافہ تو حیوانات بھی کرتے ہیں لیکن ان میں اور انسانوں میں بڑا فرق ہے۔ حیوان کا بچہ صرف پرورش کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ قانونِ جبلت کی رُو سے، از خود وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ اُسے بننا ہوتا ہے لیکن انسانی بچے کے لئے پرورش کے علاوہ تعلیم اور تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ "حیوان" سے "انسان" بنتا ہے۔ اس لئے بچے کے ماں باپ پر یہ دوہری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اس سے متعلق قواعد و ضوابط نافذ کرے' اور اس قسم کے انتظامات کرے کہ کوئی بچہ سامانِ پرورش اور اسباب تعلیم و تربیت سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس سلسلہ میں جس حد تک بچے کے ماں باپ کے تعاون کی ضرورت ہو' اس کے لئے ضروری ہدایات نافذ کرے۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی انسانی بچہ' ماں باپ یا حکومت کی غفلت' جہالت تساہل، بدنظمی یا غلط نظام کی وجہ سے ایسا نہ رہ جائے کہ اس کی انسانی صلاحیتیں نشوونما نہ پا سکیں۔ اس کے مواقع تمام بچوں کے لئے یکساں ہونے چاہئیں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ط (۱۷/۳۱؛ ۶/۱۵۲)۔ "اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے ذبح نہ کر دیا کرو۔" ذبح کرنے" سے مراد سچ مچ قتل کر دینا نہیں۔ (قتل تو الگ جرم ہے خواہ وہ اپنے بچوں ہی کا کیوں نہ ہو)۔ اس سے مطلب انہیں تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا ہے۔ اس کے لئے اسلامی حکومت کو اس امر کی ضمانت دینی چاہیئے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۔ (۶/۱۵۲)۔ "ہم تمہارے اور تمہاری اولاد' دونوں کے رزق کے ذمہ دار ہیں"۔ یاد رکھئے! اسلامی معاشرہ

لہ لغت میں قتل کے یہ معنی بھی ہیں اور قرآن کریم میں ذبح اور قتل مرادف معانی میں آیا ہے۔

میں رزق (سامانِ زیست) کے بہم پہنچانے کی اولین ذمہ داری، معاشرہ کے سر پر عاید ہوتی ہے۔

(۲) تنومند و توانا۔ صحیح و سالم بچہ خدا کی نعمت ہے۔ (۷/۱۸۹-۱۹۰) اور صاحب فہم و فراست، پاک باز، محبت بھرا دل رکھنے والا، قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا، کشادہ ظرف، بچہ اس کی رحمت (۱۹/۱۲-۱۴) اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے:

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ۔ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ۔ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا۔ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ۔ (۴۲/۴۹-۵۰)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سارا اقتدار و اختیار اسی کا ہے اور کائنات کا تمام نظم و نسق اسی کے قوانین کے تابع چلتا ہے حتیٰ کہ انسان کی طبیعی زندگی بھی اس کے قوانین کے احاطہ سے باہر نہیں۔ اُس کے قوانین کے مطابق تخلیق کا یہ محیر العقول سلسلہ جاری ہے۔ اس میں خود انسانی تخلیق بھی شامل ہے، جس کی رُو سے کسی کے ہاں صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اور کسی کے ہاں صرف لڑکے۔ اور کسی کے ہاں .... لڑکے اور لڑکیاں دونوں۔ اور کسی کے ہاں اولاد ہی نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے جس کی بنیاد علمِ خداوندی پر ہے۔

لڑکی کو لڑکے کے مقابلہ میں کمتر درجے کا سمجھنا، زمانۂ قبل از اسلام (عہدِ جاہلیت) کی ذہنیت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ان کی اسی ذہنیت پر تنقید کرتے ہوئے، قرآن کہتا ہے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ۔ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ۔ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (۱۶/۵۸-۵۹)

ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان میں سے کسی کو یہ خبر ملتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو اس کے چہرے کی رنگت سیاہ ہو جاتی ہے اور وہ غم میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ بیٹی کی پیدائش کی خبر کو اس قدر معیوب سمجھتا ہے کہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا بیٹی کو زندہ رکھ کر ہمیشہ کی ذلت برداشت کرے یا اسے زندہ دفن کر کے (اس ذلت سے نجات حاصل کرے!)

اُف! کس قدر بُرا ہے یہ فیصلہ جو یہ لوگ اپنی معصوم بچیوں کے متعلق کرتے ہیں۔!!

(۳) بیوی بچوں کو خدا نے وجہ زینت بنایا ہے اس لئے اولاد، انسان کے لئے جاذبِ توجہ ہونی چاہیئے۔ زُيِّنَ

النَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ ..... (۳/۱۳) "لوگوں کے لئے بیوی بچوں کی محبت کو خوش آئند بنا دیا گیا ہے۔" لیکن ان کی خاطر کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جو قانونِ خداوندی اور مستقل اقدار کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یہی بیوی، بچے، انسان کے لئے فتنہ بلکہ دشمن بن جاتے ہیں۔ دیکھئے آیات (۶۴/۹) (۸/۲۸) و (۶۴/۱۴-۱۵) اس لئے جب بیوی، بچوں اور کسی اور قرآنی قدر میں ٹکراؤ ہو تو قرآنی قدر کو ہمیشہ ترجیح دینی چاہیئے۔ سورۃ توبہ میں ہے:-

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۔ (۹/۲۴)

"اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہلِ خاندان، اور مال و دولت جو تم کماتے ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو، اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی)، اور اس (کے قیام و بقا) کی راہ میں جد و جہد سے زیادہ عزیز ہے، تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا انتظار کرو تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر ادھر اُدھر نکل جائے۔"

اس لئے کہ اولاد کا تعلق صرف انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں یہ انسان کے کسی کام نہیں آسکتی۔ لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا ۔ (۵۸/۱۷) "غیر صالح اولاد" کو تو قرآن انسان کے "اہل" میں سے بھی قرار نہیں دیتا۔ داستانِ حضرت نوحؑ میں اسی حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے (۱۱/۴۵-۴۶)

(۴) جب تک اولاد، ماں باپ کی پرورش، تربیت اور حفاظت میں ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت تک اسے والدین کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن جب وہ اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے کے قابل ہو جائے، اس وقت اسے اپنے امور کے فیصلے خود کرنے چاہئیں۔ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" قرآن کریم کا حکم نہیں۔ قرآن کریم نے اولاد سے اتنا ہی کہا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۱۷/۲۳)۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَکِّسْهُ فِی الْخَلْقِ ۔ (۳۶/۶۸)۔ "بڑھاپے میں انسان کی خلقی صلاحیتیں اوندھی

ہوجاتی ہیں؛ ذہنوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ پہلے معلوم تھا وہ بھی بھول جاتا ہے (۲۲/۵) لہٰذا ان کی حالت قابلِ رحم ہوجاتی ہے۔ اس لئے انہیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیئے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ (۱۷/۲۳-۲۴)

خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو۔ اُس کے سوا کسی کو اپنا حاکم تسلیم نہ کرو۔ حکومیت صرف اُس کے قوانین کی اختیار کرو۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ تم اپنے ماں باپ کو دیکھو۔ وہ جوان تھے اور کام کاج کے قابل، تو اپنے علاوہ، تمہاری پرورش بھی کرتے تھے۔ اب وہ بوڑھے ہوچکے ہیں اور کمانے کے قابل نہیں رہے، تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی اس کمی کو پورا کرو۔

بڑھاپے میں قویٰ کمزور ہوجاتے ہیں اور انسان بچوں کی سی باتیں کرنے لگ جاتا ہے (۳۶/۶۸)۔ لہٰذا اگر تمہارا باپ یا ماں یا دونوں بوڑھے ہوجائیں تو انہیں حقارت آمیز باتیں مت کہو۔ نہ ہی ان سے سختی اور درشتی سے کلام کرو۔ ان سے ادب اور عزت سے بات کرو اور کشادہ نگہی سے پیش آؤ۔

ان کی پرورش کے لئے انہیں اپنے بازوؤں کے نیچے سمٹائے رکھو (جس طرح انہوں نے بچپن میں، تمہیں اپنے بازوؤں کے نیچے سمٹائے رکھا تھا) اور ان کے حق میں ہمیشہ یہ آرزو کرو کہ جس طرح انہوں نے بچپن میں تمہاری پرورش کی تھی، تمہارا رب، تمہارے ہاتھوں، اُسی طرح، ان کی پرورش کا انتظام کرائے۔ (بچوں کی پرورش تو حیوانات بھی کرتے ہیں۔ لیکن بوڑھے والدین کی پرورش صرف انسان کا خاصا ہے۔ اسی لئے اس کی تاکید کی گئی ہے)۔

لیکن اگر وہ غلط راستے پر چل رہے ہوں تو انہیں سمجھانا چاہیئے۔ داستانِ حضرت ابراہیم میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ (۱۹/۴۱-۴۵)

(۵) اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہے کہ نہ تو چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے ماں باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ دے کہ وہ انہیں جس حال میں جی چاہے رکھیں۔ اور نہ ہی بوڑھے ماں باپ کو، اولاد کا دستِ نگر اور آستان اُفتادہ

بنادے جس سے ان کے شرفِ انسانیت کی تذلیل اور تحقیر ہو۔ اس سلسلہ میں اسلامی حکومت کی طرف سے مناسب، ہدایات نافذ اور ضروری انتظامات کئے جانے چاہئیں۔

(۰)

(۱۶) یتامیٰ

یتیم کے بنیادی معنی تو ہیں وہ جو کسی وجہ سے معاشرہ میں تنہا (بے یار و مددگار) رہ جائے خواہ وہ کتنی ہی عمر کا کیوں نہ ہو۔ لیکن موضوع زیرِ نظر کی رعایت سے، یہاں یتامیٰ سے مراد وہ بچے ہیں جن کا باپ (یا ماں باپ دونوں) مرجائیں اور وہ لاوارث ہو جائیں۔ ایسے بچوں کی پرورش، تعلیم، تربیت، نگہداشت اسلامی معاشرہ کا فریضہ ہے۔ لیکن سوال صرف ان کی پرورش کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ان کی پرورش اس انداز سے ہونی چاہیئے جس سے ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگے۔ یتیم بچوں کو یتیم خانوں میں رکھ کر اور خیرات کے ٹکڑوں پہ پال کر، ان کے شرفِ انسانیت کو جس طرح ذبح کیا جاتا ہے، وہ قوم کی تباہی کا موجب ہے۔ چنانچہ سورۃ الفجر میں ہے کہ تباہ ہونے والی قوموں میں ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ یتیموں کی عزت نہیں کرتیں بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) لہٰذا، اصل سوال ان کی عزتِ نفس کی برومندی کا ہے۔ ان پر کسی قسم کا ناجائز دباؤ نہیں ڈالنا چاہیئے۔ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹۳/۹)۔ ان کی تربیت و اصلاح کا اطمینان بخش انتظام کرنا ضروری ہے۔ ان سے اس قسم کی راہ و رسم رکھنی چاہیئے گویا وہ ہمارے بھائی ہیں۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۔ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۔ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲/۲۲۰)۔

یہ تم سے یتامیٰ کے متعلق پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان کے معاملات کو سلجھانا موجبِ خیر ہے۔ اگر تم ان سے مل جل کر رہتے ہو، یا ان کے معاملات میں شرکت کرتے ہو تو ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ یاد رکھو! ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے کون اصلاح چاہتا ہے اور کس کی نیت میں فتور ہے۔ تمہیں یہ واضح ہدایات اس لئے دی گئی ہیں کہ تمہارے لئے اصلاح کا راستہ آسان ہو جائے۔ اگر اس کا قانونِ مشیت ایسا نہ ہوتا تو وہ تمہیں اس قسم کی ہدایات نہ دیتا اور اس سے تم مشکل میں پھنس جاتے۔ لیکن خدا تمہارے لئے

آسانیاں چاہتا ہے۔ (۲/۱۸۵)۔ لیکن ان آسانیوں کے یہ معنی نہیں کہ تم جو کچھ چاہو کرو۔ تم پر کسی کا کنٹرول ہی نہ ہو۔ خدا کا قانونِ مکافات ہر بات پر پورا پورا غلبہ رکھتا ہے اگرچہ اس کا یہ غلبہ عین حکمت پر مبنی ہے۔

اگر ان کا کوئی مال اور جائیداد ہو تو اس کی پوری پوری حفاظت کرنی چاہیئے۔ جو شخص ان امور کو سرانجام دے، اگر وہ ضرورتمند نہیں تو اسے اس کا معاوضہ نہیں لینا چاہیئے لیکن اگر وہ ضرورت مند ہے تو اس کا معاوضہ لے سکتا ہے۔ جب وہ بالغ ہو جائیں اور ان میں اپنے معاملات کے سنبھالنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو ان کا مال ان کے سپرد کر دینا چاہیئے اور اس پر گواہ لے لینے چاہئیں۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا۔ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۔ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۔ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۔ وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۔ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۔ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۔ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۔ (۴/۵-۶)

یہ بھی یاد رکھو کہ مال کو، خدا نے، تمہاری قومی معیشت کا ذریعہ (قیام کا موجب) بنایا ہے۔ اس سے قومیں، اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوتی ہیں۔ اس لئے اسے ایسے لوگوں کی تحویل میں نہ دو جو اس کے انتظام کی سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے روٹی کپڑے، اور صحیح تربیت کا انتظام کر دیا کرو۔

اور یتیموں کی بھی صحیح تربیت کرو اور ان کی جانچ پڑتال کرتے رہو کہ ان کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (سنِ بلوغت ۶/۱۵۲، ۱۷/۳۴، ۴/۶) تک پہنچ جائیں۔ پھر اگر اُن میں عقل کی پختگی نظر آئے تو ان کا مال انہیں واپس دے دو (اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر (۴/۵) کے مطابق کرو)۔ اور اس خیال سے کہ وہ اب سنِ بلوغت کو جلدی پہنچ جائیں گے اور ان کا مال انہیں واپس دینا ہوگا، فضول خرچی کر کے ان کا مال ہڑپ نہ کر جاؤ۔ باقی رہا ان کے مال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا معاوضہ، سو تم میں سے جو ضرورتمند نہ ہو، اسے کچھ نہیں لینا چاہیئے۔ لیکن جو ضرورتمند ہو (یعنی ان کی جائیداد کے انتظام کے لئے اُسے جو وقت صرف کرنا پڑے، اس سے اس کی اپنی آمدنی پر اثر پڑتا ہو اور اس طرح وہ تنگدست ہو جائے)، تو وہ قاعدے اور قانون کے مطابق، حق الخدمت لے لیا کرے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو تو اس پر گواہ لے لیا کرو اور حساب فہمی کے وقت، اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور

پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے، اس لئے ٹھیک ٹھیک حساب لینے والا ہے۔
آیات (۳/۱۵۳) ؛ (۴/۶۴) میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے۔
ان کے مال میں سے ایک پائی بھی ناجائز طریق سے نہیں کھا جانی چاہیئے۔ سورۃ النسآء میں ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۔ (۴/۲)

اس قانون کی رُو سے، تمہارے اپنے بچوں اور یتیموں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس لئے، ان کے مفاد اور حقوق کی بھی اسی طرح نگہداشت کرو جس طرح تم اپنی اولاد کے مفاد کی نگہداشت کرتے ہو۔ ان کا مال و اسباب بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھو، ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں، اپنی نکمی چیزوں سے بدل لو۔ ان کا مال الگ رکھو اپنا الگ۔ اُن کے مال میں خرد برد کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے۔ (جو بچارا، معاشرہ میں تنہا رہ جائے، اُس کی مدد کرنی چاہیئے نہ کہ الٹا اس کا حق تلف کر لینا چاہیئے)۔

چند آیات آگے جا کر کہا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۔ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۔ (۴/۱۰)۔

یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں جس سے ان کے جذباتِ حرص و ہوس اور بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کی نیت نہیں بھرتی، اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

اگر معاشرہ میں بیوہ عورتیں اور ان کے ساتھ یتیم بچے رہ جائیں تو انہیں باعزت مقام دینے کے لئے قانونِ وحدتِ ازدواج میں استثنار کر کے، ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ (اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے)۔

اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کی اس راہ نمائی میں ضروری قوانین وضع کرے۔ عربی لغت کی رُو سے لڑکا سنِ بلوغت تک پہنچنے تک یتیم کہلاتا ہے لیکن لڑکی کی جب تک شادی نہ ہو جائے یتیم ہی کہلاتی ہے۔ نیز بیوہ عورتوں کو بھی یتیموں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ (۴/۱۲۷)

(۰)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآن کریم کی رُو سے عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات یہی ہیں لیکن سورۃ نسار کی ایک آیت کا ہمارے ہاں جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا۔ (۴/۳۴)

اس کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے۔

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال۔ پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں۔ نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے۔ اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تو تم ان کو سمجھاؤ۔ اور جدا کرو سونے میں۔ اور مارو۔ پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی بے شک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اس ترجمہ کی رو سے فیصلہ یہ کر لیا گیا کہ:۔

(۱) مرد عورتوں کے حاکم اور ان پر داروغہ ہیں۔

(۲) نیک عورتیں وہ ہیں جو خاوندوں کی تابعدار ہیں۔

(۳) اگر عورت، خاوند کی اطاعت نہ کرے، تو خاوند کو چاہیئے کہ

ا۔ اسے سمجھائے۔ اگر وہ اس پر بھی حکم نہ مانے تو

ب۔ اسے اپنی خواب گاہ سے الگ کر دے۔ یعنی تعلقات زناشوئی منقطع کرے۔ اور اگر وہ اس پر بھی فرمانبرداری نہ کرے تو

ج۔ اسے مارے۔

بداہتہً ظاہر ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات کی یہ نوعیت اور خاوندوں کی یہ حیثیت قرآن کریم کی اس ساری تعلیم و احکام کے خلاف ہے جن کی وضاحت گذشتہ اوراق میں کی جا چکی ہے۔ اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے:۔

جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے مردوں اور عورتوں کی بعض صلاحیتوں میں فرق ہے۔ کسی میں مردوں کو برتری حاصل ہے کسی میں عورتوں کو۔ ان فرائض کی سرانجام دہی کا نتیجہ ہے کہ عورت بیشتر وقت کے لئے کسب معاش سے معذور ہو جاتی ہے اور اس کی ضروریات کا کفیل مرد ہوتا ہے۔ (اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ) کے یہی معنی ہیں۔) اس انتظام کے بعد عورتیں اپنے مخصوص فرائض (اولاد کی پیدائش اور پرورش) کو اطمینان سے سرانجام دے سکتی ہے، لہٰذا انہیں چاہیئے کہ اپنی ان مخصوص مضمر صلاحیتوں کی حفاظت کریں لیکن اگر اس کے باوجود یہ صورت پیدا ہو جائے کہ عورتیں (بغیر کسی معقول عذر کے) ان فرائض سے سرکشی اختیار کریں تو یہ انفرادی مسئلہ نہیں رہے گا۔ قوم کا اجتماعی مسئلہ بن جائے گا کیونکہ اس کا تعلق تحفظ و افزائش نسل سے ہے۔ اس کے لئے معاشرہ کو چاہیئے کہ عورتوں کو اس کی بابت سمجھایا جائے۔ اگر یہ طریق مؤثر ثابت نہ ہو تو ان کے خاوندوں کو کہا جائے کہ وہ ان سے تعلقاتِ زناشوئی کچھ وقت کے لئے منقطع کر لیں تاکہ اس نفسیاتی اثر سے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا ہو جائے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو عدالت انہیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ مسئلہ قوم کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے اور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر عورتیں اس سلسلہ میں عدم تعاون پر اتر آئیں اور اجتماعی مفاد و انسانیت کے خلاف سرکشی برتیں تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ازالہ کے لئے مؤثر اقدامات کرے۔ یہ ایک معاشرتی جرم ہے جس کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مردوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ عورتوں کو مارنے پیٹنے پر اتر آئیں کہ وہ ان کے حاکم ہیں اور ان پر داروغہ مقرر کئے گئے ہیں۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔

وراثت اور وصیّت

(۲)

وصیّت

ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے ترکہ کے متعلق وصیّت کرے ۔ یہ وصیّت پورے ترکہ کے متعلق ہونی چاہیئے اور ہر اس شخص کے لئے ہونی چاہیئے جسے وہ اپنے ترکہ میں سے کچھ دینا چاہیئے ۔ اس میں وارث اور غیر وارث کی کوئی تفریق نہیں ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۔ (۲/۱۸۰)

تم پر یہ قانونًا فرض قرار دیا جاتا ہے کہ جب تم دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے اور تم اپنے پیچھے کچھ مال و دولت چھوڑ رہے ہو تو تم اپنے والدین اور اقربین کے لئے، قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ ایسا کرنا تمام متقین (مسلمانوں) پر فریضۂ خداوندی ہے۔ (ترکہ کی تقسیم، وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی ۔ ۴/۱۱) ۔

اس آیت میں دیکھئے ۔ پہلے کتب علیکم کہا گیا ہے یعنی تم پر فرض قرار دیا گیا ہے ۔ اور آخر میں حقًا علی المتّقین سے اس کی تاکید کی گئی ہے کہ متقین پر ایسا کرنا لازم ہے ۔ نیز اس میں پورے کے پورے مال کے لئے وصیّت کو فرض قرار دیا گیا ہے اور والدین اور اقربا کہہ کر اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ وصیّت ورثاء کے حق میں بھی ہو سکتی ہے نیز اقربا میں رشتہ دار بھی شامل ہیں اور غیر رشتہ دار بھی جنھیں وصیّت کرنے والا اپنا قریبی سمجھے ۔

(۲) قرآنِ کریم نے وصیت کی فرضیت کو اس قدر اہم قرار دیا ہے کہ اس کی جزئیات تک کے لئے بھی خود ہی

ہدایات دی ہیں۔ سورۃ مائدہ کی حسب ذیل آیات قابلِ غور ہیں۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ۔ فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيَانِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِن شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ۔ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُوا أَن تُرَدَّ أَيْمَانٌ بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاسْمَعُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۔ (۵/۱۰۶-۱۰۸)

اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو! کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آ جائے اور وہ وصیت کر رہا ہو (کیونکہ وصیت کرنا فرض ہے۔ ۲/۱۸۰) تو اس کے لئے گواہوں کی ضرورت ہو گی۔ سو تم اپنے لوگوں میں سے دو ایسے گواہ مقرر کر لو جو انصاف پسند ہوں۔ لیکن اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور ایسی جگہ پر جہاں اپنے آدمی موجود نہیں اور وہاں موت کا سامنا ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ ہی گواہ بنا لو۔

پھر جب ان کی شہادت کی ضرورت پڑے تو تمہارے جج انہیں، صلوٰۃ کے بعد (مسجد میں) ٹھیرالیں (کیونکہ وہی تمہاری عدالت گاہ ہے)، اگر تمہیں شبہ ہو کہ وہ ویسے سچ سچ نہیں کہیں گے، تو وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم نے اس گواہی کے عوض کسی سے کچھ نہیں لیا، خواہ وہ ہمارا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہی ہم سچی شہادت کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم مجرم ہوں گے۔

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے سچی گواہی نہیں دی تو جس پارٹی کے خلاف انہوں نے غلط گواہی دی تھی، اس پارٹی کے دو گواہ سامنے آئیں اور خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی، سابقہ گواہوں کے مقابلہ میں زیادہ سچی ہے۔ ہم حق سے ذرا بھی تجاوز نہیں کریں گے۔ اگر ایسا کریں تو ہم مجرم قرار دیئے جائیں۔

(قانونِ خداوندی میں شہادت پر شہادت لینے کی گنجائش اس لئے رکھ دی گئی ہے کہ اس سے) اس امر کا امکان ہے کہ گواہ حقیقت کے مطابق شہادت دیں کیونکہ انہیں اس کا خدشہ ہو گا کہ دوسرے گواہوں

کی شہادت سے اُن کی شہادت کی تردید ہو جائے گی (اور اس طرح وہ مجرم بھی قرار پائیں گے اور معاشرہ میں اُن کی بدنامی بھی ہو گی)۔

اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان باتوں کو دل کے کانوں سے سنو۔ اگر تم اس راہ کو چھوڑ کر کسی دوسری راہ پر چل نکلے تو وہ راہ تمہیں کبھی منزلِ مقصود تک نہیں لے جائیگی۔

گواہوں سے سخت تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہ کریں۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (۲/۱۸۱)

اگر کوئی شخص وصیّت سننے کے بعد اس میں ردّ و بدل کر دے تو ایسے لوگ قانون کی نگاہ میں مجرم ہوں گے۔ انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۲/۱۸۲)

لیکن اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والا انصاف سے کام نہیں لے رہا بلکہ وہ کسی کی طرف بے جا طور پر جھک رہا ہے تو اسے چاہیئے کہ وصیت کرنے والے کو سمجھائے اور متعلقہ افراد میں مصالحت کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرے تاکہ جن کی حق تلفی ہو رہی ہو اس سے وہ محفوظ ہو جائیں۔ ایسا کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ قانون میں اس قسم کی گنجائش رکھنا مرحمتِ خداوندی ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف مصالحانہ کوشش ہوگی۔ قولِ فیصل وصیت کرنے والے ہی کا ہوگا۔

(۳) بیوہ کے لئے (ترکہ میں حصے کے علاوہ) سال بھر کی کفالت کی وصیت کرنا ضروری ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ۔ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (۲/۲۴۰)

تم میں سے جو لوگ بیوہ عورتیں چھوڑ کر مر جائیں، انہیں چاہیئے کہ اپنی بیویوں کے متعلق وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک انہیں گھر سے نہ نکالا جائے اور انہیں سامانِ زندگی دیا جائے۔ لیکن اگر وہ از خود چلی جائیں

اور قاعدے قانون کے مطابق، اپنے لئے کچھ اور فیصلہ کرلیں، تو اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آتا۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون بڑی قوت والا، لیکن اس کے ساتھ ہی حکمت پر مبنی بھی ہے۔

وراثت

وراثت کے احکام، بہ حیثیت مجموعی، سورۃ النساء کی دو آیات میں دیئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان آیات کو درج کردیا جائے اور اس کے بعد ان احکام کو تفصیل وار بیان کیا جائے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۔ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۔ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۔ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۔ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۔ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۔ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۔ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۔ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۔ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۔ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۔ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۔ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۔ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۔ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۔ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۔ (۴/۱۱-۱۲)

ان آیات کی روشنی میں قانونِ وراثت کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اولاد سامنے آتی ہے۔ اس کے متعلق خدا کا حکم یہ ہے کہ:۔

(۱) لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔ یعنی ایک لڑکی = (۱/۳) اور ایک لڑکا = (۲/۳)۔ [یہ اس لئے کہ کنبے کے اخراجات کا کفیل مرد ہے، عورت نہیں۔ (۴/۳۴)]۔ آیت میں الفاظ الذکر و الانثیٰ ہیں۔ یعنی

مذکر اور مؤنث۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں خدا نے خود حصّے نہ مقرر کر دیئے ہوں اور وارثوں میں مرد اور عورتیں شامل ہوں تو وہاں یہی اصول کارفرما ہوگا۔ یعنی عورت کے مقابلہ میں مرد کا دُگنا حصّہ۔

(۲) اگر لڑکیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان سب کے لئے ترکہ کا حصّہ (۲/۳) ہے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو نصف۔ یعنی اگر لڑکے ساتھ نہ ہوں اور صرف لڑکیاں وارث ہوں تو تقسیم اس طرح ہوگی۔

(۳) متوفی کے ماں باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ (۱/۶) ہے، بشرطیکہ متوفی کی اولاد بھی ہو۔ لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور صرف اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا حصہ (۱/۳) ہے اور باقی باپ کا (۲/۳) اگر اس کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں کا حصہ (۱/۶) ہے۔ [اس کے ساتھ شق نمبر ۵ ملا یئے]۔

یاد رہے کہ یہ تقسیم متوفی کی وصیّت پوری کر دینے اور قرضہ چکا دینے کے بعد ہوگی۔ یعنی پہلے متوفی کا قرضہ چکاؤ پھر بقایا، وصیت کے مطابق تقسیم کرو۔ اگر وصیت پورے ترکہ پر حاوی نہ ہو، یا وہ وصیت نہ کر سکا ہو تو اس صورت میں تقسیم ترکہ مندرجہ بالا حصّوں کے مطابق کرو۔ اس لئے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ یا تمہاری اولاد میں سے کون سا رشتہ نفع رسانی کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے۔ لہٰذا، یہ حصّے خدا نے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ یعنی متوفی تو جانتا تھا کہ کونسا شخص اس کے ترکہ کا زیادہ حقدار ہے اس لئے وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اگر وہ وصیت نہیں کر سکا یا اس کی وصیت پورے ترکہ پر حاوی نہیں تو پھر خدا نے اسے تم پر چھوڑنے کے بجائے، حصّوں کی تقسیم کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

(۴) اب عقدی رشتوں کی طرف آیئے:۔

(ا) بیوی کے ترکہ میں سے خاوند کا حصہ (۱/۲) ہوگا بشرطیکہ اس کی (بیوی کی) اولاد نہ ہو۔ اگر اس کی اولاد ہو تو خاوند کا حصّہ (۱/۴) ہوگا۔ یہ تقسیم قرضوں کی ادائیگی اور وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔

(ب) خاوند کے ترکہ میں بیوی کا حصہ (۱/۴) ہے، اگر خاوند کی اولاد نہ ہو۔ اور اگر خاوند کی اولاد ہو تو بیوی کا حصّہ (۱/۸) ہے ۔۔ وصیت پوری کرنے اور قرضہ بیباق کرنے کے بعد۔

(۵) [شق ۳ کے تسلسل میں دیکھیئے]۔ اگر متوفی لاولد ہو (جسے کلالہ کہتے ہیں) اور اس کے ماں باپ بھی ہوں اور بھائی بہن بھی تو:۔

(ا) اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کے لئے (۱/۶) ہوگا۔

(ب) اگر بھائی بہنوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو تو وہ سب (۱/۳) میں شریک ہوں گے۔

(ج) ماں، باپ کا حصّہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ [ملاحظہ ہو شق ۳]
یہ تقسیم بھی قرضہ چکانے اور وصیّت پوری کرنے کے بعد ہو گی۔

(۶) اگر لاولد متوفی کے ماں باپ بھی نہ ہوں، صرف بہن بھائی ہوں تو ترکہ کی تقسیم آیت (۴/۱۷۶) کے مطابق ہو گی۔ جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔

ان احکام کی روشنی میں حسبِ ذیل اصولِ تقسیم متفرّع ہوتے ہیں:۔

(۱) متوفی جو کچھ چھوڑ کر مرے، اس میں سے پہلے اس کا قرضہ ادا کرنا چاہیئے اور بقایا، اس کی وصیت کے مطابق تقسیم کرنا چاہیئے۔ وصیّت کے متعلق، پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک آیت اور بھی ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ - وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ - إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۔ (۴/۳۳)

جو کچھ کسی کے والدین یا اقربا چھوڑ جائیں، ہم نے اس کے حصّے مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ حصّے صرف نسبی رشتوں تک محدود نہیں، عقدی رشتے بھی ان میں شامل ہیں۔ انہیں بھی ان کے حصے دے دیا کرو۔ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ خدا کی نگاہ ہر بات پر ہے۔

"عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ" (جن کے ساتھ تمہارے معاہدے ہیں) میں ایک تو میاں بیوی آتے ہیں کیونکہ ان کا باہمی رشتہ عقدی ہوتا ہے، نسبی نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ لوگ جنہیں کچھ دینے کے لئے معاہدہ کیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ وصیت کی رُو سے ہوگا۔

(۲) اگر متوفی وصیّت نہیں کر سکا یا اس کی وصیت پوری ہو جانے کے بعد کچھ مال بچ گیا ہے تو اس کی تقسیم آیات (۴/۱۱-۱۲) کی رُو سے ہو گی۔ عملاً طریق یہ ہونا چاہیئے کہ جن وارثوں کے متعین حصّے قرآنِ کریم نے مقرر کر دیئے ہیں، پہلے انہیں ان کا حصّہ دے دیا جائے، اور پھر دوسرے ورثاء کو دیا جائے۔

اگر قوانینِ بالا کے مطابق ترکہ کی تقسیم کے بعد کچھ بچ جائے تو وہ اسلامی حکومت کی طرف منتقل ہو جائیگا۔ جس طرح لاوارث کا ترکہ حکومت کی ملکیت قرار پاتا ہے۔

وہ آیت جس میں ایسے کلالہ کا ذکر ہے جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد، حسبِ ذیل ہے۔

يَسْتَفْتُونَكَ - قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ - إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ - وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ - فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ

فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۔ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (۴/۱۷۶)

(اس سورۃ کے شروع میں وراثت کے قوانین بیان کئے گئے تھے جن میں کلالہ ۔ یعنی لاولد کا ذکر بھی آیا تھا۔ وہاں اُس لاولد مرنے والے کا ذکر تھا جس کے ماں باپ اور بہن بھائی موجود ہوں ۔ ۴/۱۲) ۔ اسی ضمن میں یہ لوگ تم سے کچھ مزید دریافت کرتے ہیں ۔ کہو کہ اس کے متعلق تمہیں خود خدا بتاتا ہے۔

اگر کوئی شخص مرجاتے اور اس کی نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ۔ تو اس کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی۔

(۱) اگر متوفی مرد ہو اور اس کی صرف ایک بہن ہو تو ترکہ میں اس کا حصہ نصف ہوگا ۔

(۲) اگر ایک بہن کے بجائے دو (یا دو سے زیادہ) بہنیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی (۲/۳) حصہ ہوگا۔ [دو بہنوں سے زیادہ کے لئے آیت (۴/۱۱) دیکھئے]

(۳) اور اگر بھائی بہن ملے جلے ہوں، تو سارا ترکہ ان کا ہوگا اور ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ کا اصول کارفرما ہوگا (۴/۱۱)

(۴) اگر متوفیہ عورت ہو تو اس کے ترکہ کا وارث اس کا بھائی ہوگا ۔

(یہ تقسیم قرضہ کی ادائیگی اور وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی ۴/۱۲)

اللہ تمہیں یہ احکام کھول کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو ۔ اور اللہ ہر بات کا صحیح صحیح علم رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے احکام و قوانین علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں ۔

ان آیات سے واضح ہے کہ کلالہ (لاولد متوفی) کی دو قسمیں ہوں گی ۔ (۱) جس کے ماں باپ ہوں ۔ اور (۲) جس کے ماں باپ نہ ہوں ۔ ان دونوں کے ترکہ کی تقسیم الگ الگ طریق سے ہوگی ۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔

اگر تقسیم ترکہ کے وقت ایسے لوگ بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں کوئی حصہ نہ ہو لیکن وہ مستحقِ امداد ہوں تو انہیں بھی ان کی دل جوئی کے لئے (عدالت) کچھ دے سکتی ہے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ (۴/۸)

اگر تقسیم وراثت کے وقت، ایسے رشتہ دار بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں حصہ نہ ہو، یا دوسرے یتیم اور مساکین، تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو اور سمجھا دو کہ ترکہ کی تقسیم، قانون اور قاعدے کے مطابق ہوگی جس کی رو سے

انہیں بطورِ حق کچھ نہیں مل سکتا۔ جو کچھ انہیں دیا گیا ہے محض ان کی دل جوئی کی خاطر ہے۔
ترکہ تقسیم کرنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا۔ (۴/۹)۔

ترکہ کی تقسیم صحیح قاعدے کے مطابق کرنی چاہیئے۔ اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر تم بھی اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جاؤ تو تم کبھی نہیں چاہو گے کہ اُن سے بے انصافی ہو۔ لہٰذا، تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان معاملات میں ایسی بات کرو جو بالکل صاف، سیدھی اور محکم ہو۔

یہ حدود اللہ ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت جزئی قوانین خود مرتب کریگی۔ "حدود" کے معنی ہوتے ہیں وہ (FRAME WORK) جس کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت جزئی قوانین مرتب کرنے کی مجاز ہے۔ یہ حدود غیر متبدل ہوں گی لیکن ان کے تحت وضع کردہ جزئیات حالات کیمطابق بدلتی رہیں گی ـــــ خدا کا مقرر کردہ، غیر متبدل ـ انسانوں کا وضع کردہ قابلِ تغیر و تبدل۔

یتیم پوتے کی وراثت

وراثت کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں والد صرف باپ کو کہتے ہیں اور ولد (اولاد) بیٹے (بیٹیوں) کو۔ لیکن عربی زبان میں (اور قرآنِ کریم کی رُو سے) والد میں باپ، دادا، پردادا (اور پر تک) سب شامل ہوتے ہیں۔ اسطرح ولد میں بیٹا، پوتا، پڑپوتا (نیچے تک) شامل ہوتے ہیں۔ ان معانی کے پیشِ نظر تقسیم ترکہ کا اصول ایک مثال سے سمجھئے۔

زید
عمر ـــــ رشید

اس میں زید کا بیٹا عمر ہے اور عمر کا بیٹا رشید۔ یعنی رشید، زید کا پوتا ہے۔ زید کی وفات پر اسکے ولد (بیٹے) عمر کو بیٹے کا حصہ ملیگا۔ لیکن اگر عمر پہلے فوت ہو چکا ہے تو وہ حصہ رشید کو ملیگا، کیونکہ اب وہ زید کا ولد ہے۔ یعنی یتیم پوتا اپنے دادا کے ترکہ سے حصہ پائیگا۔ قرآنِ کریم کی رُو سے وہ محروم الارث نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح، رشید کی وفات پر اس کا والد (عمر) اس کے ترکہ سے حصہ پائیگا۔ لیکن اگر عمر پہلے مر چکا ہے تو رشید کے ترکہ سے وہی (باپ والا حصہ) زید کو ملیگا۔ کیونکہ اب وہی اس کا والد ہے۔ یہی اصول دادی، نانا، نانی اور نواسہ، نواسی وغیرہ کی صورت میں کارفرما ہوگا۔

جنسی تعلقات و جرائم

(۳)

(۱) زنا

اپنی منکوحہ بیوی کے سوا، کسی اور سے جنسی اختلاط زنا ہے۔ قرآنِ کریم میں مومنین کی خصوصیات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:-

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ . اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ - (۲۳/۵-۶)

(مومن وہ ہیں) جنہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا اور انہیں صرف اپنی بیویوں پر صرف کیا، یا ان لونڈیوں پر جو (انسدادِ غلامی کے متعلق قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے ۴۷/۴) ان کے ملک میں آچکی تھیں۔ (لیکن جنہیں، نکاح کے بعد بیویوں کا ہم پلہ قرار دیا جا چکا تھا)۔ ان سے زناشوئی کے تعلقات رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔

اِس کے بعد ہے:-

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ - (۲۳/۷)۔ (نیز ۷۰/۳۱-۲۹)

جو کوئی ان کے علاوہ، جنسی تعلق کی کوئی صورت اختیار کرے تو وہ قانون شکنی ہوگی اور حدودِ خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے۔ (۴/۲)۔

(۲) زنا، جرم ہے اور اس میں (بجز زنا بالجبر کے) مرد اور عورت دونوں یکساں مجرم ہوتے ہیں۔ سورۃ النور

میں ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲۴/۲)

زانی عورت اور زانی مرد، دونوں کو سوسو کوڑوں کی سزا دو۔ یہ قانون کا معاملہ ہے اس لئے اس میں کسی قسم کی نرمی نہ برتو، اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو (یعنی اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہو کہ یہ احکام خداوندی ہیں اور ان کے نتائج تمہارے سامنے آکر رہیں گے ــــ خواہ اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ یہ سزا مومنین کے ایک گروہ کی موجودگی میں نافذ کرو (جو اس کے گواہ بن سکیں کہ سزا قاعدے کے مطابق دی گئی ہے)۔

(قرآن کریم میں یہ نہیں آیا کہ اس فعل کے ارتکاب کے ثبوت کے لئے چار عینی شاہدوں کی شرط ہے۔ اس سلسلہ میں "مبادیاتِ زنا" کا ذیلی عنوان دیکھئے جو آگے آتا ہے)۔

(۳) جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے، جرم زنا کی سزا (مرد اور عورت دونوں کے لئے) سوسو کوڑے ہے۔ (رجم یا سنگسار کرنے کا ذکر قرآن میں نہیں)۔

(۴) لونڈی زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا (شریف عورت کے مقابلہ میں) نصف ہے۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۔ (۴/۲۵)

جب یہ لونڈیاں تمہارے نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد بے حیائی (زنا) کی مرتکب ہوں تو ان کی سزا، آزاد عورتوں کی سزا (۲۴/۲) سے نصف ہے۔ (اس لئے کہ ان کی تربیت اچھے ماحول میں نہیں ہوئی اور ان کی پہلی زندگی میں اس قسم کی حرکات معیوب تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ اس لئے ان سے اخلاق کا وہ بلند معیار متوقع نہیں ہو سکتا جو شریف گھرانے کی عورتوں سے متوقع ہو سکتا ہے۔ سزا کے تعین میں ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہے)۔

اس سے ایک اہم اصول مستنبط ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کسی جرم کی سزا کا فیصلہ کرتے وقت، مجرم کے ماحول، تربیت، ذہنیت وغیرہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ "لونڈی" کی سزا نصف مقرر کرنے سے مقصد یہی ہے۔ دوسری طرف کہا

گیا ہے کہ اگر (بفرضِ محال)، نبی کی بیوی سے اس قسم کا جرم سرزد ہو تو ان کی سزا دُگنی ہوگی۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ
وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ (۳۳/۳۰)

اے نبی کی بیویو! اگر تم میں سے کسی سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی تو اسے اس کی دُگنی سزا ملے گی۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔ (یہ اس لئے کہ تمہاری زندگی کو دوسری عورتوں کے لئے نمونہ بننا ہے)۔

(۵) ایسے حالات پیدا نہ کرو جن سے، وہ جو تمہارے زیرِ اثر ہوں، زنا کے لئے مجبور ہو جائیں۔ سورۃ النور میں ہے:-

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔
وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۲۴/۳۳)

اور تمہاری نوجوان لڑکیاں (نوکرانیاں یا لونڈیاں) جو نکاح کا ارادہ رکھتی ہوں، انہیں، اپنے دنیاوی مفاد کی خاطر، اس سے نہ روکو۔ اس طرح وہ بدکاری پر مجبور ہو جائیں گی۔ اور اگر کوئی انہیں اس طرح مجبور کریگا، تو قانونِ خداوندی میں یہ شق بھی موجود ہے کہ وہ اس جبر کے خلاف، ان کی حفاظت کرے اور انہیں سامانِ نشوونما مہیا کرے۔ (اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا کرے)۔

(۲) لواطت" یا سحاقت

اگر دو مرد (یا دو عورتیں) "فحش" کی مرتکب ہوں تو انہیں مناسب سزا دو۔ (اس کی سزا قرآن کریم نے خود مقرر نہیں کی)، لیکن اگر ان میں اصلاح کا امکان ہو تو (عدالت کی صوابدید کے مطابق) انہیں معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا۔ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا۔ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ (۴/۱۶)

اگر دو مرد اس قسم کی (بے حیائی) کی حرکت کے مرتکب ہوں تو انھیں (مناسب) سزا دو۔ لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اس سے باز آجائیں اور (اپنی) اصلاح کرلیں، تو ان سے درگزر کرو۔ اللہ کے قانون میں معافی کی گنجائش بھی ہے (جو اکثر حالات میں جرم کی روک تھام کا موجب بن کر باعثِ) رحمت بن جاتی ہے۔

اس آیت میں صیغہ (وَالَّذٰنِ) تو مذکر کا ہے (یعنی دو مرد) لیکن استنباطاً اس سے مراد "دو عورتیں" بھی ہو سکتی ہیں.
ہم نے اسی لئے عنوان میں "سحاقت" بھی لکھ دیا ہے جس کی مرتکب دو عورتیں ہوتی ہیں.

قرآنِ کریم نے قصہ قوم لوط میں "لواطت" (HOMO SEXUALITY) کو بڑا ہی شنیع اور مذموم فعل قرار دیا ہے۔ اس سے بھی اس فعل کا ارتکاب جرم قرار پا جاتا ہے۔ (دیکھئے ۷/۸۰ : ۸۴)

نوٹ: اختلاطِ ہم جنس کے لئے ہمارے ہاں "لواطت" کی اصطلاح عام ہے. لیکن چونکہ اس سے ذہن حضرت لوط (علیہ السلام) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو خدا کے رسول تھے، اس لئے اس اصطلاح کو نہ ہی استعمال کیا جائے تو اچھا ہے۔ اس کے لئے "اغلام" کی اصطلاح بھی رائج کی جا سکتی ہے۔

(۳) مبادیاتِ زنا

(۱) جو عورت کسی ایسی حرکت کی مرتکب ہو جو زنا کی طرف لے جانے والی ہو (یعنی عام بے حیائی کی باتیں) اور اس کے لئے چار گواہ موجود ہوں، تو اُسے مکان سے باہر جانے سے روک دینا چاہیئے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْھِدُوْا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَھِدُوْا فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا۔ (۴/۱۵)

اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکت سرزد ہو (جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہو سکتی ہو) تو ان کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ اس کی شہادت دیں اور جرم ثابت ہو جائے) تو ان عورتوں کو باہر آنے جانے سے روک دو "تا آنکہ انہیں موت آ جائے" یا خدا کا قانون ان کے لئے ایسی صورت پیدا کر دے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے رُک جائیں — مثلاً اگر وہ شادی شدہ نہیں تو ان کی شادی ہو جائے۔

(زنا کی سزا کا ذکر ۲۴/۲ میں ہے اور تہمت لگانے کا ۲۴/۴ میں)۔

اس آیت میں "الفاحشۃ" کا ترجمہ عام طور پر زنا کیا جاتا ہے. لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں اس لئے کہ قرآنِ کریم نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے (۲۴/۲) اور یہاں سزا صرف "پابندِ مسکن" کرنا ہے اس لئے اس سے مراد زنا نہیں بلکہ ایسی بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا پر منتج ہو سکتی ہیں۔ ہم نے اسی لئے اس کا مفہوم "مبادیاتِ زنا" لیا ہے۔ جرمِ زنا کے ثبوت کے لئے گواہوں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔

(۲) شادی شدہ عورت سے "کھلی ہوئی بے حیائی" کا ارتکاب ہو تو اس کے مہر میں سے کچھ رقم وضع کی جا سکتی

ہے۔ (تفصیل مہر کے عنوان میں گذر چکی ہے۔ متعلقہ آیت (۴/۱۹) ہے۔

(۴) فواحش

(۱) فواحش کے قریب مت جاؤ خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا چھپی ہوئی۔ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۶/۱۵۲؛ نیز ۷/۳۳)۔ "بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ"

(۲) فواحش کی اشاعت و تشہیر مت کرو۔ ایسا کرنا مستوجب سزا جرم ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِيۡعَ الۡفَاحِشَةُ فِى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔ (۲۴/۱۹)

یاد رکھو۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعت مومنین کے اندر، بے حیائی کی باتیں پھیلائیں، انھیں اس زندگی میں بھی (از روئے قانون) سخت سزا ملے گی، اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اللہ خوب جانتا ہے (کہ اس قسم کی باتیں کس قدر تباہی کا موجب ہوتی ہیں) اور تم اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس میں تمام وہ اسباب و ذرائع آجائیں گے جن سے معاشرہ میں بے حیائی کی باتیں یا خیالات پھیلتے ہیں۔

(۳) ان جرائم کے مرتکبین میں اگر اصلاح کا امکان ہو تو معافی کی گنجائش ہے۔

وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ (۳/۱۳۴)

اگر مومنین سے کبھی (غلطی سے) کوئی معیوب حرکت سرزد ہو جاتی ہے، یا وہ اپنے آپ پر (یا ایک دوسرے پر) زیادتی کر بیٹھتے ہیں، تو وہ اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے، بلکہ، فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں، (اور اُس کے مطابق، اپنی اصلاح کرکے، اپنی غلطی کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان طلب کر لیتے ہیں — اور حقیقت یہ ہے کہ غلط اقدامات کے مضر اثرات سے، قانونِ خداوندی کے سوا اور کہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؛

(۵) شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ۔ یا ان کے خلاف غلط باتیں مشہور کرنا۔

یہ سنگین جرم ہے جس کی سزا حقوقِ شہریت سے محرومی سے لیکر موت تک ہو سکتی ہے۔ سورۂ احزاب میں

پہلے کہا:۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ - وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا - (۳۳/۵۹)

اے نبی! تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے کپڑوں کے اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا پہن لیا کریں جس سے زینت نمایاں نہ ہو۔ (۳۳/۵۹)۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جاسکیں (کہ شریف بیبیاں جارہی ہیں) اور کوئی بدقماش انہیں تنگ نہ کرے۔ یہ چیز، ان کے لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے حفاظت اور تربیت کا موجب بن جائے گی۔

اس کے بعد فرمایا:۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ مَّلْعُوْنِيْنَ ۔ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا - (۳۳/۶۰-۶۱)

تم اتنی احتیاط برتو۔ اگر اس کے بعد بھی منافقین یعنی وہ لوگ جن کے دل میں خباثتیں بھری ہوئی ہیں اور وہ فتنہ پرور جن کا کام ہی معاشرہ میں شرانگیز خبریں پھیلانا ہے، اپنی خباثتوں سے باز نہ آئیں تو پھر ان کے خلاف قوت کا استعمال کرنا پڑیگا اس سے یہ لوگ، کچھ عرصہ بعد، یہاں سے دور ہو جائینگے اور اُن تمام مراعات سے محروم کر دیئے جائینگے (جو انہیں اسلامی مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں)۔ اگر یہ اس پر بھی اپنی سرکشی سے باز نہیں آئینگے تو جہاں کہیں بھی ہوں گے، انہیں گرفتار کیا جائے گا، اور سختی سے قتل کیا جائے گا۔

۶۔ تہمت تراشی

(۱) پاک دامن عورتوں کے خلاف تہمت لگانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار گواہ لائے۔ اگر جرم ثابت نہ ہو تو تہمت لگانے والے کی سزا اسّی کوڑے ہے۔ اس کے بعد اس شخص کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ ہاں اگر اس میں اصلاح کا امکان ہو تو اسے معاف کیا جاسکتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا - وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ - اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ

ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۲۴/۴-۵)۔ (نیز دیکھئے ۲۴/۲۳ ز ۶/۱۲)

(عصمت متاعِ گراں بہا اور مستقل قدر ہے اس لئے اس کی حفاظت کے لئے بڑی پختہ تدابیر کرنی چاہئیں)۔ اس سلسلہ میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسّی کوڑے لگاؤ۔ اور اس کے بعد ایسے ساقط الاعتبار لوگوں کی، جو دوسروں کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائیں، گواہی قبول نہ کرو (اور انہیں ان حقوق سے بھی محروم کر دو جو اسلامی مملکت کے شریف انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس پر بھی اس سے باز نہ آئیں تو انہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو۔ ۲۴/۲۳) اس لئے کہ یہ لوگ صحیح راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

ہاں! اگر یہ لوگ، اس کے بعد اپنی غلط روش سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو پھر انہیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں، توبہ و اصلاح کے بعد عفو اور درگزر کی گنجائش رکھ دی گئی ہے (اس سے، اتفاقی مجرم، سزا سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور وہ سامانِ نشو و نما سے بھی محروم نہیں رہتا۔)

(۲) جو شخص خود اپنی بیوی کے خلاف تہمت لگائے اور گواہ نہ لا سکے تو وہ چار مرتبہ قسم اٹھائے اور پانچویں مرتبہ اپنے اوپر لعنت وارد کرے، لیکن اگر اس کے خلاف، اس کی بیوی اپنی بریت کے لئے بھی اسی طرح قسم اٹھالے تو پھر وہ مجرم متصور نہیں ہوگی۔ سورۃ النور میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (۲۴/۶-۹)

جو لوگ خود اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں، اور ان کے پاس، سوائے اپنے آپ کے، اور کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے معاملہ میں یوں فیصلہ کیا جائے کہ مرد، چار بار اللہ کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ سچ کہتا ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہو، تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو (یعنی میں ان تمام حقوق و مفادات سے محروم کر دیا جاؤں جو مجھے مملکتِ خداوندی (اسلامی حکومت) کا شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں)۔

(اس سے وہ عورت مجرم قرار پا جائے گی۔ لیکن، اگر وہ، اپنی مدافعت میں بھی) اسی طرح خدا کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹ بولتا ہے ۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔

(یعنی مجھے اس حلفِ دروغ گوئی کی سزا ملے، تو اس سے وہ بری الذمہ ہو جائے گی)

(۳) جرم خود کرے (خواہ وہ کوئی جرم ہو) اور اس کی تہمت دوسرے پر لگا دے تو یہ جرم ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا۔ (۴/۱۱۲)

سوچو کہ اگر کوئی شخص جرم یا خطا تو خود کرے اور اسے تھوپ دے کسی دوسرے بے گناہ کے سر، تو یہ بجائے خویش بہت بڑا جرم ہے۔ اس طرح اس نے اپنے اوپر دوہرا بوجھ لاد لیا۔ ایک تو اس جرم کا بوجھ جو اس سے سرزد ہو گیا تھا، اور دوسرا اس بہتان کا بوجھ جو اس نے دوسرے کے اوپر لگا دیا۔

(۷) پرائیویسی

کسی کے گھر میں بلا اجازت نہیں جانا چاہیئے۔ سورۃ النور میں ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ۔ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ۔ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ۔ (۲۴/۲۷-۲۹)

اے جماعتِ مومنین! جب تم اپنے گھر کے علاوہ، کسی اور کے ہاں جاؤ، تو پہلے ان سے اجازت طلب کرو، اور جب وہ اجازت دے دیں تو اندر جاؤ اور تمام اہل خانہ کو سلامتی کی دعائیں دو، اور ان کے لئے نیک آرزوئیں لے کر جاؤ۔

ان آدابِ معاشرت کی نگہداشت تمہارے لئے بہت ہے تاکہ تمہارا معاشرہ انسانی روابط کے عمدہ ترین اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

اور اگر تم دیکھو کہ اس گھر میں کوئی نہیں، تب بھی اس کے اندر نہ جاؤ ــــ کوئی شکل بھی ہو، دوسروں کے گھروں میں صرف اس صورت میں داخل ہو جب تمہیں اس کی اجازت مل جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ آپ اس وقت واپس تشریف لے جائیں تو (دل میں کوئی گرانی لئے بغیر) واپس آ جاؤ۔

ان امور کی نگہداشت سے تمہارے حالات سنورے رہیں گے۔ اللہ کا قانون تمہاری ہر بات کا اچھی طرح علم رکھتا ہے۔

البتہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ایسے مکانات میں بلا اجازت داخل ہو جاؤ جن میں کوئی بستا نہیں اور ان میں تمہارا سامان رکھا ہے (جیسے گودام وغیرہ۔ لیکن اگر وہ مشترکہ گودام ہے اور اس میں تم اکیلے داخل ہو رہے ہو، تو تمہارے دل میں کسی قسم کی بددیانتی کا خیال نہیں آنا چاہیئے)۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات اچھی طرح جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے ہو اور دل میں کیا چھپاتے ہو۔

(۸) عورتوں کی طرف سے سرکشی

اس کے لئے پہلے افہام و تفہیم سے کام لیا جائے۔ پھر انہیں عارضی طور پر الگ کر دیا جائے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو عدالت بدنی سزا دے سکتی ہے۔ (۴/۳۴)، عورت بھی مرد کے خلاف اسی قسم کی چارہ جوئی کر سکتی ہے۔ (۴/۱۲۸)۔ اس سلسلہ میں مزید وضاحت، اس سے پہلے (میاں بیوی کے تعلقات سے متعلق عنوان میں آچکی ہے) دیکھیئے عنوان" طلاق " اور" ایک غلط فہمی کا ازالہ" (ص ۶۸ ; ص ۸۹)

حفاظتِ جان

(۱) انسانی جان کی اہمیّت

(۱) بنی اسرائیل کی طرف یہ حکم بھیجا گیا تھا کہ جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو بچا لیا۔ یہ بڑی اہم آیت ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲)۔

(یہ آدم کے دو بیٹوں کا قصہ (جو بنی اسرائیل کے ہاں زبان زدِ عوام تھا) درحقیقت اُن کی اپنی جذباتی کیفیت کا ترجمان تھا کہ وہ بات بات پر آمادہ بہ قتل ہو جایا کرتے تھے) چنانچہ اسی وجہ سے، ہم نے ان کی طرف یہ تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ یاد رکھو! جو شخص کسی دوسرے کو قتل کر ڈالے ۔۔ بجز اس کے کہ وہ جرمِ قتل کے قصاص میں ہو (یعنی قتلِ ناحق کے لئے سزائے موت کے طور پر) یا ملک میں فساد برپا کرنے والے مجرمین کو قانون کے مطابق موت کی سزا دی جائے۔ تو اس قسم کے بے گناہ قتل کے متعلق یوں سمجھو گویا اس شخص نے (ایک فرد کو قتل نہیں کیا) پوری کی پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ اس کے برعکس جس شخص نے کوئی ایک جان بچا لی تو اُس نے گویا پوری نوع انسان کی جان بچا لی۔

مومنین سے کہا گیا کہ ایک دوسرے کو قتل مت کرو۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴/۲۹)

(۲) انسانی جان کو خدا نے واجب الاحترام بنایا ہے۔ اس لئے اسے حق کے بغیر ضائع کرنا جرم ہے۔ حق کے معنی ہوں گے قانونِ خداوندی کے مطابق۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۶/۱۵۲)؛ (۱۷/۳۳؛ ۲۵/۶۸)۔

"انسانی جان کو خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے اسے ناحق قتل مت کرو۔"

(۳) جرمِ قتل کا مواخذہ کرکے، مجرم کو سزا دینا، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى۔ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ۔ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۷۸-۱۷۹)

اے جماعتِ مومنین! تم پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ تم قتل کے مجرم کا تعاقب کرکے اسے قانون کے مطابق سزا دو (بالفاظِ دیگر اسے قاتل اور مقتول کے وارثوں کے مابین نجی معاملہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے معاشرہ یا نظام کے خلاف جرم سمجھا جائے۔ یہ نظام اسے اپنے ہاتھ میں لے)

سزا کے سلسلہ میں، عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی اس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سوال مقتول یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رُو سے ہر انسانی جان یکساں قیمت رکھتی ہے۔ (مثلاً) اگر قاتل آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اس کا عورت ہونا اُسے سزا سے نہیں بچا سکے گا، اسے بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔

جرمِ قتل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ قتل بالارادہ (قتلِ عمد) یا سہواً (نادانستہ) قتل۔ اوّل الذکر کی صورت میں سزائے موت ہے (زرِ فدیہ۔ دیت۔ خون بہا نہیں) — یا جرم کی نوعیت کے لحاظ سے، انتہائی سزا سے کمتر کوئی اور سزا (۴/۹۳) — لیکن سزا کو جرم کی حد سے بڑھ نہیں جانا چاہیئے۔ (۱۷/۳۳ ؛ ۲/۱۹۴)

لیکن قتل، اگر عمداً نہیں کیا گیا، یونہی سہواً ہو گیا ہے، تو اس صورت میں (۴/۹۲) کے مطابق دیت (خون بہا) کی سزا دی جائے گی۔ اس دیت (کی رقم) سے اگر مقتول کا وارث، برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے، تو اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے (۲/۱۷۸)۔ اس صورت میں مجرم کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ طے ہو گیا ہے، اُس کی پابندی کرے اور حسن کارانہ

اندازسے اِس کی ادائیگی کرے۔ (قتلِ سہو کی سزا مقرر کرنے میں) تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے، تم سب کی صلاحیتیں مناسب نشوونما پاتی رہیں۔ لیکن جو شخص، اس طرح معاملہ طے ہوجانے کے بعد، زیادتی کرے تو اسے سخت سزا دی جائے۔

اگر تم، سطحی جذبات سے ہٹ کر، عقل وفکر کی رو سے غور وفکر کروگے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ قصاص کے اِس قانون میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے تم لاقانونیت کے خطرات سے محفوظ رہ سکوگے۔

دوسرے مقام پر کہا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۔ (۱۷/۳۳)

جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ (اُسے واجب الاحترام قرار دیا ہے۔ یعنی بے گناہ کا قتل۔ ۵/۳۲) اسے قتل مت کرو، بجز اس کے کہ ایسا کرنا قانونِ عدل کا تقاضا ہو۔ (۲/۱۷۸)۔ جو شخص ظلم سے، ناحق مارا جائے (تو قاتل یہ نہ سمجھ لے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حامی اور مددگار نہیں۔ اس لئے کون مجھ سے باز پرس کرسکتا ہے) مقتول کے وارثوں کے لئے ہم نے نظامِ خداوندی (اسلامی معاشرہ) کو صاحبِ غلبہ واختیار بنایا ہے۔ اس لئے، یہ نظام خود مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا۔ لیکن معاشرہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مجرم کی سزا، قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے دے۔ اُن سے تجاوز نہ کرے۔ (۶/۱۵۲؛ ۴۲/۴۰)

(۴) بنی اسرائیل کی طرف حکم بھیجا گیا تھا کہ جان کے بدلے جان۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان۔ دانت کے بدلے دانت۔ نیز زخموں کا قصاص۔ لیکن اس میں معاف کردینے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۔ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۵/۴۵)

ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ قانون مقرر کر رکھا تھا کہ جس شخص نے کسی کو (ناحق) قتل کر دیا اس کی سزا موت ہوگی۔ جان کا بدلہ جان۔ آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ کان کا بدلہ کان۔ ناک کا بدلہ ناک۔ دانت کا بدلہ دانت۔ — یعنی صرف جرمِ قتل ہی مستوجبِ سزا نہیں۔ کسی کو زخمی کر دینا بھی ایسا جرم ہے جس کی سزا دی جائے گی اور سزا جرم کے مثل

ہو گی۔ لیکن اگر مستغیث، مجرم کو معاف کر دے، تو یہ چیز مجرم کی سزا کا کفارہ ہو جائے گی۔

یہ تھا وہ قانونِ قصاص جو ان کی کتابوں میں، ان کے لئے دیا گیا تھا۔ انہیں اسی کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں تھے۔ اس لئے کہ جو شخص اس ضابطۂ قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرے جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ ہیں جو حق و انصاف سے کام نہیں لیتے۔ ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔

(۵) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کی رُو سے قتلِ عمد (بالارادہ) اور قتلِ خطا (سہواً) میں فرق کیا گیا ہے۔ قتلِ خطا کے لئے فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا۔ (۴/۹۲)

کسی مومن کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اگر کسی کے ہاتھوں کوئی مومن غلطی سے مارا جائے تو وہ اس کے بدلے میں، ایک مومن غلام آزاد کرے۔ نیز مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دے (۴/۹۲)۔ اگر وہ خون بہا معاف کر دیں تو پھر اور بات ہے ـــ لیکن اگر ایسا ہو کہ کوئی قوم تم سے برسرِ پیکار ہے اور ان میں کوئی مومن مرد ہے جو تمہارے ہاتھوں غلطی سے مارا جاتا ہے، تو اس کے کفارہ کے طور پر ایک مومن غلام آزاد کیا جائے گا۔ (خون بہا نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ جنہیں تم خون بہا دو گے وہ تو تم سے جنگ کر رہے ہیں)۔ لیکن اگر وہ شخص اس قوم سے ہو جس کے ساتھ تمہارا معاہدۂ صلح ہے تو اس صورت میں اس کے وارثوں کو خون بہا بھی دینا ہو گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا بھی۔ لیکن اگر قاتل کے پاس غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہو یا ایسی صورت ہو کہ غلام ملے ہی نہیں تو وہ دو مہینے کے متواتر روزے رکھے۔ یہ چیز، قانونِ خداوندی کی رُو سے عفوِ خطا کا موجب بن جائے گی، اُس قانونِ خداوندی کی رُو سے جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

ور قتل بالارادہ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ

وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ۔ (۴/۹۳)

اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے تو ـــــ خونِ ناحق کی سزا موت تو ہوگی ہی (۲/۱۷۸) ـــ مرنے کے بعد بھی وہ جہنم میں جائے گا جہاں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ قانونِ خداوندی کی نگاہوں میں وہ معتوب ہوگا۔ اسے حقوقِ شہریت وغیرہ سے محروم کر دیا جائے گا[1]۔ اور سخت قسم کی سزا دی جائے گی[2]۔ قتلِ عمد میں خون بہا یا کفارہ نہیں ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ دِیت یا خون بہا کی اجازت قتلِ خطا میں ہے۔ قتلِ عمد میں نہیں۔ اس کی سزا موت ہے۔

(۶) قتلِ اولاد سے منع کیا گیا ہے (لیکن جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، اس میں قتل سے مراد انہیں تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہو سکتا ہے اور سچ مچ مار دینا بھی)۔ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۔ (۶/۱۵۲)۔ نیز دیکھئے (۶/۱۴۱؛ ۱۷/۳۱؛ ۶۰/۱۲)۔

(۷) ہلاکتِ حرث و نسل (کھیتی اور نسل کا تباہ کر دینا) فساد ہے۔ مستبد حکمرانوں کے متعلق کہا گیا ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۔ (۲/۲۰۵)

جب ان لوگوں کو حکومت اور اقتدار مل جاتے تو ان کی ساری کوشش یہ ہوگی کہ ملک میں تباہیاں اور ویرانیاں عام ہو جائیں۔ فصلیں تباہ ہو جائیں۔ نسلِ انسان ہلاک ہو جائے ـــ نہ معاشی نظام میں توازن رہے نہ عمرانی نظام میں۔ انہیں صرف اپنی مفاد پرستی کا خیال ہوتا ہے۔ اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہوتی کہ ملک پر کیا گذرتی ہے ـــ حالانکہ جس خدا کو یہ بات بات پر بطور گواہ پیش کرتے ہیں وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ دنیا میں تباہی اور ویرانی پھیلائی جائے۔

نوٹ:۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس قسم کے جرائم کے سلسلہ میں مجرم کو سزا دینا ہی کافی نہیں۔

---

[1] لعنت کے معنی ہیں کسی کو محروم کر دینا۔ قانونی طور پر اس سے مراد ان مراعات سے محروم کر دینا ہوگا جو اسے اس مملکت کا شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں۔

[2] ان تصریحات سے مترشح ہوتا ہے کہ قتلِ عمد میں بھی جرم کی نوعیت کے اعتبار سے، موت سے کم تر سزا دی جا سکتی ہے مثلاً کسی نے فوری جذباتِ غیرت سے مشتعل ہو کر کسی کو قتل کر دیا تو اسے دوسری قسم کی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

حکومت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ مقتول کے ورثاء کے نقصان کی تلافی کرے۔ یہ تلافی حکومت خود کرے یا مجرم سے کرائے، مقتول کے ورثاء کو اس سے غرض نہیں۔ ان کے نزدیک مدعا علیہ حکومت ہوگی نہ کہ ملزم۔ اس لئے کہ حکومت نے پُرامن شہریوں کو ان کی جان۔ مال۔ عصمت۔ عزت۔ آبرو۔ مساکن وغیرہ کی حفاظت کی ضمانت دی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی ضائع ہوگئی ہے (بشرطیکہ وہ اس کے مالک کی عدم احتیاط، تغافل، یا تساہل کی وجہ سے نہ ہو) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہ گئی ہے۔ اس لئے جس کا نقصان ہوا ہے اس کا دعویٰ حکومت کے خلاف ہوگا، نہ کہ براہِ راست مجرمین کے خلاف۔

حفاظتِ مال

(۵)

(۱) باطل کے ذریعے (یعنی خلافِ قانون طریق سے) ایک دوسرے کا مال کھانا جرم ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (۲/۱۸۸)۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ یعنی "ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ"۔ (نیز ۴/۲۹)

(۲) یتیموں کے مال کے متعلق خاص طور پر تاکید کی گئی ہے کہ اسے باطل طور پر نہ کھاؤ۔ سورۃ النسآء میں ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۔ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۔ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۔ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۔ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۔ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۔ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۔ (۴/۶)۔ (نیز ۶/۱۵۳؛ ۱۷/۳۴)۔

اور یتیموں کی بھی صحیح تربیت کرو اور ان کی جانچ پڑتال کرتے رہو کہ ان کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہوتی ہے، حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (سنِ بلوغت ۶/۱۵۳؛ ۱۷/۳۴؛ ۴۲/۶) تک پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں عقل کی پختگی نظر آئے تو ان کا مال انہیں واپس دے دو (اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر (۴/۵) کے مطابق کرو) اور اس خیال سے کہ وہ اب سنِ بلوغت کو جلدی پہنچ جائیں گے اور ان کا مال اُنھیں واپس دینا ہوگا، فضول خرچی کر کے، ان کا مال ہڑپ نہ کر جاؤ۔ باقی رہا ان کے مال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا معاوضہ، سو تم میں سے جو ضرورتمند نہ ہو، اسے کچھ نہیں لینا چاہیئے۔ لیکن جو ضرورت مند ہو (یعنی ان کی جائیداد کے انتظام کے لئے اُسے جو وقت

صرف کرنا پڑے، اُس سے اس کی اپنی آمدنی پر اثر پڑتا ہو اور اس طرح وہ تنگدست ہو جاتے) تو وہ قاعدے اور قانون کے مطابق، حق الخدمت لے لیا کرے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو، تو اس پر گواہ لے لیا کرو۔ اور حساب فہمی کے وقت، اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے، اس لئے ٹھیک ٹھیک حساب لینے والا ہے۔

(۳) جس طرح سے مذہبی پیشوا لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں وہ بھی جرم ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۴)

(اے جماعتِ مومنین! ان کے علماء و مشائخ میں سے، جنہیں یہ خدائی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ دوسروں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں۔ اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں۔ (کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔)

اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے جو شخص (بجز معذورین) خود محنت کر کے نہیں کماتا، وہ دوسروں کا مال باطل طریق سے کھاتا ہے۔ اس میں سرِفہرست مذہبی پیشوا آتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے بعد سرمایہ دار ہیں جو روپیہ کے بل بوتے پر دوسروں کی محنت کا ماحصل لے جاتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی مندرجہ بالا آیت کے پہلے حصہ میں مذہبی پیشواؤں کا ذکر ہے اور اگلے حصہ میں سرمایہ داروں کا۔ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو مذہبی پیشوائیت شدید ترین قسم کی سرمایہ داری ہے۔ سرمایہ دار پھر بھی اپنا روپیہ لگا کر اس پر کچھ وصول کرتا ہے۔ یہ لوگ بلا سرمایہ لگائے دوسروں کی کمائی ہتھیا لیتے ہیں۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے اسے باطل ذریعہ معاش قرار دیا ہے۔

(۴) رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلے مت لو۔ آیت (۲/۱۸۸) کا پہلا حصہ پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۱۸۸)

(اور دیکھو) آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے نہ کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک جا چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں؟

(۵) ماپ تول پورا رکھو۔ سورۃ انعام میں اصولاً کہا گیا ہے کہ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۲)۔ (نیز ۱۷/۳۵) "ماپ تول کے پیمانے اور ترازو (عدل کے مطابق) ٹھیک رکھو"۔ لیکن سورۃ التطفیف میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ۔ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ۔ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔ (۸۳/۱-۳)

سوداگرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس ذہنیت کی رُو سے کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں سے اپنے واجبات پورے پورے لئے جائیں لیکن جب ان کے واجبات دینے کا وقت آئے تو ترازو میں ڈنڈی ماری جائے۔ دوسروں سے کام پورا لیا جائے لیکن اس کا معاوضہ کبھی پورا نہ دیا جائے۔ محنت کرنے والوں کو کم از کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ کمایا جائے۔ چیزوں ہی کی نہیں بلکہ خود انسانوں کی قیمت متعین کرتے وقت بھی یہی خیال رہے، اور کوشش یہ کی جائے کہ ان کی صلاحیتیں دبی، سمٹی، سکڑی اور بندھی رہ جائیں۔ انہیں پوری جولانی کا موقعہ ہی نہ ملنے پائے۔ انہیں اتنا ہی ابھرنے دیا جائے جتنا سرمایہ لگانے والے کے لئے مفید ہو۔ انہیں اس سے زیادہ آزادی دی ہی نہ جائے۔

(۶) **مَیْسِرْ** - اس کے عام معنی جوا کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک جامع اصطلاح ہے جس میں ہر ایسا مال آ سکتا ہے جو آسانی سے حاصل کر لیا جائے۔ یعنی جسے ہمارے ہاں "بائیں ہاتھ کا کھیل" کہا جاتا ہے۔ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہوتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (۲/۲۱۹)

اے رسولؐ! تجھ سے یہ لوگ خمر اور میسرہ کے متعلق پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان میں (نظر بظاہر) فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ لیکن (درحقیقت) ان کے نقصانات، ان کے فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں؛ لہٰذا، ان سے اجتناب ضروری ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ ۔ (۵ / ۹۱-۹۰)

اے جماعتِ مومنین! خمر، میسرہ، انصاب، ازلام (جن کا ذکر ۲/۲۱۹ اور ۵/۳ میں آچکا ہے)، ایسے کام ہیں جن سے معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں ماؤف ہوجاتی ہیں (۵/۹۰)۔ لہٰذا، تم ان سے اجتناب کرو تاکہ یہ تمہاری کامیابی کے راستے میں روڑا بن کر نہ اٹک جائیں۔

اگر تم اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے خمر اور میسرہ جیسی عادات پر اتر آئے تو یہ چیزیں (انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ) تم میں باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گی، اور قوانین خداوندی کو پیشِ نظر رکھنے اور نظامِ صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گی۔ کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں رہو گے؟

قرآنِ کریم نے خمر اور میسرہ کی سزا خود مقرر نہیں کی۔ اسے اسلامی مملکت پر چھوڑا ہے کہ وہ حالات کے مطابق ان کی سزا خود مقرر کرے۔

(۷) قرعہ اندازی۔ لاٹری

اسے بھی قرآن نے میسرہ کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ سورۃ المآئدہ کی مندرجہ بالا آیت (۵/۹۰) میں "ازلام" سے مراد قرعہ اندازی ہے۔ یہی الفاظ (۵/۳) میں آئے ہیں۔

۲۔ چوری (سرقہ)

سرقہ کی سزا "قطع ید" ہے۔ خواہ سارق عورت ہو یا مرد۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ۔ وَاللَّهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۵ / ۳۸)

چور، مرد ہو یا عورت، مجرم ہونے کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ اس لئے ان کی سزا میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اس کے لئے ایسا طریق اختیار کرنا چاہیئے جس سے خود چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رُک جائیں اور دوسروں کے لئے بھی، قانونِ خداوندی کی رُو سے روک بن جائے۔ یعنی وہ مجرم کے لئے 'موجبِ اصلاح' (CURATIVE) ہو اور دوسروں

کے لئے جرم سے اجتناب کا باعث (PREVENTIVE) لیکن اگر یہ دیکھو کہ پانی سر سے گذر چکا ہے اور یہ جُرم عام ہو رہا ہے تو اس کی انتہائی سزا یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ بہرحال، مقصد اس جُرم کی روک تھام ہے ــــ خواہ غلبہ و قوت سے ہو، خواہ حسنِ تدبیر سے۔ (عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ میں یہ دونوں باتیں آ جاتی ہیں)۔

لیکن اس کے ساتھ ہی کہا:-

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ (۵/۳۹)۔

مقصد چونکہ جُرم کی روک تھام ہے اس لئے جو شخص ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر نادم ہو اور اپنی اصلاح کر لینے کا یقین دلائے تو قانونِ خداوندی میں اس کے لئے معافی کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ ایسے شخص کو سزا سے بھی محفوظ رکھا جائے گا اور عام سہولتوں سے بھی محروم نہیں کیا جائے گا۔

"قطع ید" سے مراد ہاتھ کو کاٹ کر الگ پھینک دینا ہی نہیں۔ اس کے معنی (i) ہاتھوں کو محض زخمی کر دینا بھی ہیں۔ (۱۲/۳۱)۔ یا (ii) کسی کام سے روک دینا بھی۔ جیسے قطع لسان کے معنی کسی کو زبان درازی سے روک دینے کے ہوتے ہیں۔ خود (۵/۳۸) میں اسے نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ کہا گیا ہے یعنی خدا کی طرف سے روک۔

نوٹ:- عنوانِ "قتل" کے نیچے جو نوٹ دیا گیا ہے اس کا اطلاق چوری پر بھی ہوگا یعنی جس کے ہاں چوری ہوئی ہے اُس کے نقصان کی تلافی حکومت کے ذمے ہوگی۔

۳۔ قرض

قرض کا لین دین لکھ لینا چاہیئے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے بڑی تفصیلی ہدایات دی ہیں کہ یہ تحریر کس قسم کی ہونی چاہیئے اور اس کا طریق کیا ہو۔ (دست بدست لین دین کی تحریر کی ضرورت نہیں)

(i) اسے کاتب لکھے۔

(ii) مقروض یا اس کا ولی اس کی املا کرائے۔

(iii) دو مرد گواہ ہوں۔ اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہونی چاہئیں۔

(iv) کاتب یا گواہوں کو کسی قسم کی مضرت نہیں پہنچانی چاہیئے۔ یہ تمام تفاصیل سورۃ بقرہ کی آیت (۲/۲۸۲) میں

مذکور ہیں جو پہلے درج کی جاچکی ہے اور جو قرآنِ مجید کی سب سے لمبی آیت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی تفاصیل ہدایات (DIRECTIVES) کی ذیل میں آئیں گی نہ کہ قوانین (LAWS) کے زمرے میں۔

(۲) مقروض کو ادائیگی قرضہ کی مہلت دینی چاہیئے۔ اور اگر وہ اس قدر تنگ دست ہے کہ قرضہ ادا ہی نہیں کرسکتا تو اسے معاف کر دینا چاہیئے۔ متعلقہ آیت (۲/۲۸۰) ربٰو کے عنوان میں سامنے آئیگی۔

۴۔ رہن

اگر قرض کا معاملہ بحالتِ سفر طے پاستے اور تحریر کے لئے کاتب نہ مل سکے، تو مقروض کی کوئی چیز، قرض خواہ بطور ضمانت اپنے پاس رکھ سکتا ہے لیکن اگر اسے اُس پر اعتماد ہو تو پھر اس کی ضرورت نہیں۔ لین دین کی تفاصیل سے ملحق آیت میں ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۔ (۲/۲۸۳)

اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور تمہیں کاتب نہ مل سکے تو قرض لینے والے کی کوئی چیز بطور امانت اپنے پاس رکھ لو۔ اور اگر تمہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو پھر اس کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں مقروض کو چاہیئے کہ دیانت داری سے قرض واپس کر دے اور اس طرح قانونِ خداوندی کی پابندی کرے۔

۵۔ ربٰو

جیسا کہ "معاشی نظام" کے عنوان میں بتایا جائیگا، قرآنِ کریم کی رُو سے، معاوضہ محنت کا ہے سرمایہ کا نہیں سرمایہ پر نفع لینا ربٰو ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ کسی کو سرمایہ دے کر صرف سرمایہ واپس لیا جاسکتا ہے۔ اس پر بڑھوتی نہیں لی جاسکتی۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم متعلقہ آیات کو ترتیب وار درج کرتے ہیں۔ پہلے ربٰو کے اثرات اور تخریبی عواقب کے متعلق دیکھئے۔ فرمایا:-

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ

مِنَ الْمَسِّ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۔ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۔ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (۲/۲۷۵) ۔

[ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو، اپنا پیٹ کاٹ کر، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں (۹/۵۹) اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو قرض دیتے ہیں تو، ان کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر، جتنا دیتے ہیں اس سے زیادہ وصول کرتے ہیں]۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی حالت یوں سمجھو جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور وہ دیوانہ وار، اِدھر اُدھر بھاگتا پھرے۔ (یعنی ہوسِ زر ان کے سینے میں آگ لگا دیتی ہے جس سے وہ ہر وقت مضطرب و بیقرار رہتے ہیں) یہ لوگ اپنی اس روش کے جواز میں، دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ربٰو (سرمایہ پر اصل سے زیادہ وصول کرنا، تجارت کی مثل ہے، دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ (جس طرح تجارت میں، دوکاندار، گاہک سے، اپنے اصل زر سے زاید لیتا ہے، اسی طرح ربٰو میں، روپیہ دینے والا اپنے اصل سے زیادہ وصول کرتا ہے)۔ یہ ان کی کٹ حجتی ہے۔ تجارت میں انسان روپیہ بھی لگاتا ہے اور، اس کے ساتھ، محنت بھی کرتا ہے۔ جو کچھ وہ زاید لیتا ہے، وہ اس کے روپے کا منافع نہیں ہوتا، اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اور یہ بالکل جائز ہے۔ اس کے برعکس، ربٰو میں، محنت کچھ نہیں ہوتی۔ محض روپے پر منافع لیا جاتا ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ (اس ضمن میں اس اصول کو یاد رکھو کہ جائز صرف محنت کا معاوضہ ہے (۵۳/۳۹)۔ خالی سرمایہ لگا کر، دوسروں کی محنت کا ماحصل لے لینا جائز نہیں ہے۔ اس کو ربٰو کہتے ہیں)۔

سو جس شخص تک خدا کا یہ قانون پہنچ جائے اور وہ اپنی سابقہ روش سے رُک جائے، تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے وہ اُس کا ہے۔ نظامِ خداوندی کی رُو سے، اس سے مؤاخذہ نہیں ہوگا لیکن جو اس سے نہ رُکے یا دوبارہ یہی روش اختیار کرے تو یہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی اور ان کے لئے اس عذاب سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اس کے بعد ربٰو اور صدقات کا تقابل اس طرح کرایا گیا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۔ (۲/۲۷۶)

یاد رکھو! ربٰو، جس کے متعلق انسان بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اس سے سرمایہ بڑھتا ہے، درحقیقت خود بھی مٹتا ہے اور اُس قوم کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اس کے برعکس، جو کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیا جاتا ہے اور جس کے متعلق بظاہر

یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے سرمایہ میں کمی آجاتی ہے، خود بھی بڑھتا ہے اور اس قوم کے بڑھنے، پھولنے، پھلنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

ربٰو سے یہ ذہنیت عام ہو جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے، سامانِ زیست کو لوگوں سے چھپا کر رکھا جائے تاکہ وہ اس کے محتاج ہوں اور قرض لینے پر مجبور۔ اور قرض دینے والا، ان کی محنت کی کمائی پر عیش اڑائے۔ اس سے انسان کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ سفرِ زندگی میں آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا۔ لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری کی حامل قوم، تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِىْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۔ (۳۰/۳۹)۔

یاد رکھو! جو کچھ تم دوسروں کو اس لئے دو کہ اس کے بدلے میں، تمہیں، ان کے مال و دولت میں سے، اس سے زیادہ ملے جو تم نے انہیں دیا ہے، (تو ہو سکتا ہے کہ اس سے تمہیں، تمہارے حساب کے مطابق کچھ زیادہ مل جائے لیکن) قانونِ خداوندی کی رو سے، اس سے تمہارے مال و دولت میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا۔ (یہ تمہیں اس لئے اضافہ نظر آتا ہے کہ تم انفرادی طور پر حساب کرتے ہو۔ اگر تم پوری انسانیت کو سامنے رکھ کر غور کرو تو تم دیکھ لو گے کہ یہ اضافہ نہیں ہے)۔ اس کے برعکس، جو کچھ تم اس لئے دو کہ اس سے دوسروں کی نشو و نما ہو جائے اور اس میں تمہیں کسی قسم کے ذاتی معاوضہ کا خیال نہ ہو، بلکہ تم یہ اس لئے کرو کہ اس سے تمہاری زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائے گی، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے دیئے ہوئے مال ہیں فی الحقیقت اضعافاً ہوتے ہیں (۲/۲۷۵-۲۷۶؛ ۳/۱۲۹؛ ۷۳/۲۰)۔

ربٰوا کو حرام قرار دینے کے بعد، سابقہ معاملات کے متعلق فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (۲/۲۷۸)

اے جماعتِ مومنین! تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی رہ گیا ہے اسے معاف کر دو۔ تمہارے ایمان کا یہی تقاضا ہے۔

یہاں مومن ہونے کی شرط یہ بتائی ہے کہ ربٰو کے بقایا کو چھوڑ دینا ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے گا اس کے متعلق فرمایا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ

اَمْوَالِکُمْ۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۷۹)

اگر تم ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر اس اعلان کو نظامِ خداوندی کی طرف سے الٹی میٹم (اعلانِ جنگ) سمجھو اور لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ (اس لئے کہ دینِ خداوندی، نظامِ سرمایہ داری کا کھلا ہوا دشمن ہے اور ان دونوں میں کبھی مفاہمت نہیں ہو سکتی) اگر تم اس روش سے باز آجاؤ تو تم اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو، تاکہ نہ تم پر کوئی زیادتی ہو، نہ مقروض پر۔

اس سے اس جرم کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یعنی ربٰو کے نظام کو، اسلامی نظام کے خلاف بغاوت کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور یک جا نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد کہا۔

وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۸۰)

اگر مقروض تنگ دست ہے، تو اسے اتنی مہلت دو کہ وہ قرض بسہولت ادا کر سکے۔ اور اگر تم اُسے بالکل ہی معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے۔ بشرطیکہ تم، دوررس نگاہ سے دیکھ سکو کہ اس میں کس قدر اجتماعی مفاد مضمر ہیں۔

سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت خاص طور پر غور طلب ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ۔ (۳/۱۳۰-۱۲۹)

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً، تو ہمارے ہاں اس کے عام طور پر معنی کئے جاتے ہیں "دگنا چوگنا"۔ یعنی سود در سود۔ اور مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس سے سود مرکب سے منع کیا گیا ہے۔ یہ معانی قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہیں۔ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ محض سرمایہ پر ہر قسم کی بڑھوتری حرام ہے۔ خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ قرض دینے والا صرف رأس المال (اصل زر) واپس لے سکتا ہے۔ اس سے زاید کچھ نہیں لے سکتا۔ آیات (۳/۱۳۰-۱۲۹) کا صحیح مفہوم یہ ہے:۔

اے جماعتِ مومنین! معاشرتی تباہی میں سب سے بڑا حصہ ربٰو کا ہے (یعنی محض سرمایہ سے نفع کمانا)۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس سے دولت بڑھتی ہے (انفرادی طور پر تو ایسا ہی نظر آتا ہے) لیکن درحقیقت اس سے (قومی دولت میں) کمی اور کمزوری واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا اے جماعتِ مومنین! تم ربٰو کے (سرمایہ دارانہ) نظام کو اختیار نہ کر لینا

تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی کامیابی کی صحیح راہ ہے۔

اگر تم محنت سے دولت پیدا کرنے کے بجائے، سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کرنی شروع کر دو گے، تو ہر اُس قوم کی طرح جو نظامِ خداوندی کی مخالفت کرتی ہے، تمہارا معاشرہ بھی جہنمی معاشرہ بن جائیگا۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہودیوں کی تباہی کے اسباب میں سے ایک سبب ان کا ربٰو کا نظام بھی تھا۔ سورۃ النساء میں ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۔ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۔ (۴/۱۶۰-۱۶۱)

ان کی اس قسم کی زیادتیوں اور سرکشیوں کا نتیجہ تھا کہ وہ خوشگوار چیزیں جو پہلے ان کے لئے حلال تھیں، سزا کے طور پر ان پر حرام قرار دیدی گئیں (۶/۱۴۶)۔ ان کے جرائم کی فہرست طویل ہے لیکن مختصراً یہ سمجھو کہ یہ لوگ ہمیشہ نظامِ خداوندی کی راہ میں، جو عالمگیر انسانیت کی نفع بخشیوں کی راہ ہے، روک بن کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہ محتاجوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ انھیں کچھ قرض دیتے تھے تو اصل سے زیادہ واپس لیتے تھے۔ حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ یوں اس طرح، نیز دوسرے طریقوں سے، لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھایا کرتے تھے۔ اور اب تک یہی کچھ کرتے ہیں۔

یہ ہیں ان کے جرائم جن کی وجہ سے یہ قوم اس قدر درد انگیز عذاب میں مبتلا ہے۔

(۴) ربٰو کی اس تعریف کی رُو سے، کاروبار میں روپیہ لگا کر نفع میں شریک ہو جانا (جسے مضاربت کہا جاتا ہے) یا زمین، بٹائی یا ٹھیکہ پر دے دینا (جسے مزارعت سے تعبیر کیا جاتا ہے) سب ربٰو میں شامل ہوں گے۔

۶۔ تجارت (بیع)

(۱) ربٰو حرام ہے اور بیع حلال۔ سورۃ بقرہ کی یہ آیت پہلے گزر چکی ہے (۲/۲۷۵) جس میں کہا گیا ہے کہ ربٰو حرام ہے اور بیع حلال۔ دوسرے مقام پر کہا کہ:-

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ

عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۔ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۔ (۴/۳۰-۲۹)

اے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا کہ دوسروں کا مال ناجائز طریق پر کھا جاؤ۔ معاشرہ میں ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے (جسے تجارت کہتے ہیں)۔ اس کا انتظام باہمی رضامندی سے ہونا چاہیئے۔ اس اصول کے مطابق کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ مل جائے (۵۳/۳۹)۔ یہ نہیں کہ ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر دوسروں سے زیادہ سے زیادہ بٹور لینے کی کوشش کرے (۴/۲۹)۔ اگر ایسا کروگے تو تم اپنے آپ کو تباہ کر لوگے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ تم سب کی نشو ونما ہوتی رہے۔ لہٰذا جس معاشی نظام میں یہ مقصد فوت ہو جائے وہ جائز نہیں قرار پا سکتا۔

ایسی کھلی کھلی تاکید کے بعد بھی جو قوم اپنا کاروبار اس انداز پر رکھے گی کہ ہر شخص دوسرے کے حق میں کمی کرے اور اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ معاشرہ بہت جلد تباہیوں کی آگ میں جھلس کر رہ جائے گا۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے ایسا آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جو نظام منفعتِ عامہ کے خلاف قائم ہو اس کی تباہی کے سامان خود اس کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

(۲) دست بدست تجارتی معاملات کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔ (۲/۲۸۲)۔

نوٹ:۔ ہم اوپر ربٰو کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ معاوضہ محنت کا ہے سرمایہ کا نہیں۔ اس لئے تجارت میں سرمایہ پر صرف اتنا نفع لیا جا سکتا ہے جو تاجر کی محنت کا معاوضہ ہو۔ اس باب میں حکومتِ اسلامی ضروری ہدایات نافذ کرے گی۔

۷۔ خیانت

(۱) امانت ان کے مالکوں کی طرف لوٹا دو۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔ (۴/۵۸)

(۲) امانات میں خیانت نہ کرو۔ اس میں نظامِ مملکت کی "امانات" بھی شامل ہیں۔ یعنی تمام ذمہ داریاں جو مملکت کی طرف سے تمہارے سپرد کی جائیں یا راز داری کی ایسی باتیں جو انتظامیہ کا رکن یا کارندہ ہونے کی حیثیت سے تمہارے علم میں آئیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۸/۲۷)

اے جماعتِ مومنین! تم نہ تو نظامِ خداوندی (خدا ورسول) سے کسی قسم کی خیانت کرو، اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔

(۳) خیانت کرنے والوں کی وکالت مت کرو۔ سورۃ النساء میں اس ضمن میں بڑے تفصیلی احکام دیئے گئے ہیں۔ فرمایا:-

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۔ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۔ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۔ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۔ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۔ (۴/۱۰۵-۱۰۹)

(اے رسولؐ!) خدا نے تیری طرف یہ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے نزاعی امور کے فیصلے اس علم کے مطابق کرو جو اللہ نے تمہیں اس طرح عطا کیا ہے۔ اور ایسا کبھی نہ کرو کہ دغاباز اور خیانت کرنیوالوں کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔

حکومت اور عدالت کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس میں انسان کے ذاتی میلانات، فیصلوں پر اثر انداز ہو جایا کرتے ہیں۔ اس سے انسان اسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ وہ ہر وقت "قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھے اور اسی کے پیچھے پناہ لے۔ تم اسی طرح" اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے رہو۔ قانونِ خداوندی میں ایسی حفاظت اور مرحمت کا پورا پورا انتظام ہے۔

اس بات کو پھر سمجھ لو کہ جو لوگ ایک دوسرے سے، یا خود اپنی ذات سے، خیانت کرتے ہیں، ان کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہو۔ خیانت کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس سے اسے کچھ مل گیا ہے۔ حالانکہ اس سے اس کی ذات میں ایسی کمزوری آجاتی ہے جس سے اُس کی انسانی صلاحیتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں (اسی کو خود اپنی ذات سے خیانت کہتے ہیں)۔ سو ایسے لوگ قانونِ خداوندی کی نگاہ میں کیسے پسندیدہ قرار پا سکتے ہیں؟

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم اپنے جرائم، لوگوں سے چھپا سکتے ہیں اس لئے ہم پر کیا گرفت ہوگی؟ لیکن یہ خدا کے قانون کی نگاہوں سے کیسے چھپ سکتے ہیں؟ وہ تو اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو

چھُپ چھپ کر، ناپسندیدہ امور کے متعلق مشورے کرتے ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔ (۴۰/۱۹)۔

(یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات ایسا نہیں کہ اس کا سلسلہ صرف اسی دنیا تک محدود ہو کہ اگر کسی نے ایسا انتظام کر لیا کہ وہ یہاں قانون کی گرفت سے بچ جائے تو وہ مواخذہ سے چھوٹ گیا۔ بالکل نہیں۔ ہر جرم کا اثر مجرم کی ذات پر مرتب ہوتا ہے (۶/۱۶۴)۔ اور انسانی ذات اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ اس لئے انسان کے اعمال کے نتائج مرنے کے بعد بھی سامنے آجاتے ہیں۔ بنا بریں) اگر تم کسی مجرم کے طرفدار بن کر، اُس کی طرف سے، اس دنیاوی زندگی میں جھگڑتے ہو اور اس طرح اُسے (غلط بیانیوں سے) قانون کی گرفت سے بچا بھی لیتے ہو) تو یہ بتاؤ کہ اُس کے اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت، اس کی طرف سے کون جھگڑ سکے گا، اور کون اس کی وکالت کے لئے کھڑا ہو سکے گا؟

(۴) مومن اپنی امانات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ (۲۳/۸ ; ۷۰/۳۲)

عہد و پیمان

(۶)

(۱) عہد کی پابندی ضروری ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ (۵/۱)۔ "اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان پورے کیا کرو۔" "عقود" میں انفرادی عہد و پیمان بھی آجاتے ہیں اور قومی معاہدات بھی۔ دوسری جگہ ہے وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ۔ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا۔ (۱۷/۳۴)۔ "تم اپنے عہد و پیمان پورے کیا کرو۔ یاد رکھو! تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنا عہد پورا کیا تھا یا نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ عہد شکنی قابلِ مؤاخذہ ہے۔"

(۲) مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عہد کی پابندی کرتے ہیں۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (۲۳/۸)۔ یہ لوگ اپنی امانات اور عہد کی پاسداری کرتے ہیں۔ (نیز ۱۳/۲۰؛ ۲/۱۷۷؛ ۷۰/۳۲)

(۳) قرآنِ کریم میں ایک جامع ہدایت ہے جس میں کہا گیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (۶۱/۲-۳)۔ "اے جماعتِ مومنین! تم وہ کچھ کیوں کہتے ہو جو کر کے نہیں دکھاتے۔ خدا کے نزدیک یہ بات بڑی مذموم ہے کہ ایسی باتیں کہی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے۔ انسان کے قول اور فعل میں ہمیشہ مطابقت ہونی چاہیئے۔" اگرچہ اس ارشادِ خداوندی کا مفہوم بڑا وسیع ہے لیکن اس میں بہرحال یہ بات بھی آجاتی ہے کہ جو عہد کسی سے کیا جائے اس کے مطابق کر کے بھی دکھایا جائے۔ اسے پورا کیا جائے۔

(۴) جو عہد "خدا کے ساتھ" کیا جائے اس کا پورا کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا

ارشادِ خداوندی ہے۔ خدا کے ساتھ باندھے ہوئے عہد میں وہ ذمہ داریاں بھی آجاتی ہیں جنھیں انسان خدا پر ایمان لا نے سے اپنے اوپر عائد کر لیتا ہے اور وہ ذمہ داریاں بھی جو حکومتِ خداوندی (اسلامی مملکت) کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ اس عہد کو توڑنے والوں کے متعلق کہا۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ۔ (۱۳/۲۵)۔

ایک وہ لوگ ہیں جو اس عہد کو جو انھوں نے خدا کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا تھا، توڑ ڈالتے ہیں اور انسانیت کے جن رشتوں کو جوڑنے کا اس نے حکم دیا تھا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں (۱۳/۲۱؛ ۲/۲۷) اور اس طرح دنیا میں فساد اور ناہمواریاں برپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کا انجام بڑا ہی خراب ہوتا ہے۔

دوسری جگہ اسے "عہد فروشی" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ فرمایا۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ...... (۱۶/۹۵)۔ "اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کو دنیاوی مفاد کے متاعِ قلیل کے عوض فروخت مت کرو"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں اسلامی مملکت کے خلاف سازشیں بھی شامل ہیں جنہیں غدارانِ ملت ذاتی مفاد کی خاطر، قوم کے دشمنوں کے ساتھ مل کر یا ان کا آلہ کار بن کر کرتے ہیں۔ (نیز ۳/۷۶؛ ۳/۷۷)۔

سب سے بڑا اور بنیادی عہد جو ایک انسان اپنے خدا سے کرتا ہے اور جس سے وہ "مسلمان ہوتا ہے" یہ ہے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال (یعنی سب کچھ) خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے:۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)۔ "یہ حقیقت ہے کہ اللہ مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے"۔ یہ عہد محض نظری یا اعتقادی نہیں ہوتا۔ اسے عملاً ایسا کرنا ہوتا ہے اور عملاً اس کی شکل یہ ہے کہ یہ عہد، خدا کے نام پر قائم شدہ اسلامی مملکت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں۔

[ان معاہدات کے لئے جو دوسری اقوام سے کئے جائیں ۔ "امور مملکت" سے متعلق عنوان دیکھئے]

حرام وحلال

(۷)

(۱) اشیائے خورونوش میں سے یہ چیزیں حرام ہیں۔ (۱) لحمِ خنزیر (سور کا گوشت)۔ (۲) مردار۔ (۳) بہتا ہوا لہو۔ (۴) جس چیز کو خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ (۲/۱۷۳ ؛ نیز ۵/۳ ؛ ۶/۱۴۵)

اب یہ سُن لو کہ خدا نے حرام کس کس چیز کو قرار دیا ہے — مردار، بہتا ہوا خون (۶/۱۴۵)۔ خنزیر کا گوشت۔ اور ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔

اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لئے اور کچھ نہ ملے، اور تم (جان بچانے کے لئے) مجبور ہو جاؤ تو ایسی حالت میں، ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی یا ہوس پروری کی نہ ہو۔ اضطراری حالت میں ان چیزوں کے کھانے سے تمہاری ذات پر جو مضر اثرات مرتب ہوں گے، قانون کے احترام کا محکم احساس، تمہیں ان اثرات سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما بدستور ہوتی رہے گی۔

"اضطراری حالت" کا فیصلہ قانون کی رُو سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا فیصلہ انسان خود ہی کر سکتا ہے اور جس شخص کا خدا کے قانون پر ایمان ہے اس کے لئے اس کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

(۲) طعامِ اہلِ کتاب حلال ہے۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۔ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۔ (۵/۵)

تم نے غور کیا کہ حلت وحرمت کے قرآنی احکام نے انسانی زندگی میں کیا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے؟ اس سے پہلے انسانوں کی خودساختہ شریعتوں نے اس باب میں ہزار قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس سے انسانی آزادی کا دم گھٹ رہا تھا۔ قرآن نے دو رہیں۔ چند چیزوں کو حرام قرار دیکر باقی تمام خوشگوار چیزیں حلال قرار دیدی گئیں۔ اس سے کس قدر میدان وسیع ہو گیا۔

نیز اہل کتاب کے ہاں کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ (اس میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو تمہارے ہاں حرام ہے۔ اور) وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے جائز سمجھیں۔

ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی شرط یہ ہوگی کہ ان کے ہاں کے کھانے میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ آیت کے آخری حصے سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مقصود معاشرتی روابط قائم کرنا ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی روابط قائم نہ رکھیں، ان کے ساتھ ایسے روابط قائم نہیں رکھے جاسکتے۔

(۳) حالتِ احرام میں صید البحر (پانی کا شکار) تو حلال ہے لیکن خشکی کا شکار حلال نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۔ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۔ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۔ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۔ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۔ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ (۵/۹۵-۹۶)

اے جماعتِ مومنین! تم حدودِ حرم کے اندر شکار مت مارو۔ (ہم نے کعبہ کو امن کا مقام قرار دیا ہے (۳/۹۶) ہماری اس ضمانت کا تقاضا ہے کہ انسان تو انسان، حیوان بھی اس کے اندر آجائے تو اسے امن مل جائے) اگر تم میں سے کوئی حدودِ حرم کے اندر ارادۃً شکار کرلے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جو جانور تم نے مارا ہے اس کی مثل کوئی مویشی تحفۃً کعبہ تک پہنچا دیا جائے (تاکہ وہ ضرورت مندوں کے کھانے کے کام آئے ۲۲/۲۸)۔ اس بات کا فیصلہ کہ کون سا جانور اس جانور کے ہم پلہ ہے جسے شکار کیا گیا تھا تم میں سے دو صاحبِ انصاف آدمی کریں (جنہیں اس کا علم ہو کہ کونسا

جانور کس جانور کے ہم پلہ ہوتا ہے۔

یا اس کا کفارہ اُس جانور کی قیمت کے برابر مسکینوں کا کھانا ہے یا اسکے برابر روزے رکھنا (اس حساب سے جس کا ذکر (۵/۸۹) میں کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ تین روزے دس مسکینوں کے کھانے کے برابر ہوتے ہیں۔

یہ اس لئے ہے کہ تم نے جو دیدہ دانستہ حدود شکنی کی ہے اس کا خمیازہ بھگتو (اور تمہارا نفس پابندیوں کے احترام کا خوگر ہوجائے)۔

یہ حکم اب سے نافذ ہوگا۔ اس سے پہلے جو ہوچکا، سو ہوچکا۔ جو اس کے بعد ایسا کرے گا اسے سزا دی جائے گی۔ اس لئے کہ وہ قانون قانون ہی نہیں ہوتا جس کی خلاف ورزی کی سزا نہ ہو اور اگر اسکے پیچھے ایسی قوت نہ ہو جو اس سزا کو عمل میں لاسکے تو وہ قانون وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا نظام خداوندی میں قانون شکنی کی سزا بھی ہے اور ایسی قوت بھی جو اس سزا کو نافذ کرسکے۔

یہ پابندی کہ حدود حرم کے اندر شکار کرنا حرام ہے خشکی کے جانوروں تک محدود ہے۔ جہاں تک پانی کے جانوروں کا تعلق ہے، ان کا کھانا جائز ہے۔ خواہ انہیں تم خود شکار کرو یا انہیں پانی اچھال کر خشکی پر پھینک دے، یا پانی کے پیچھے ہٹ جانے سے وہ خشکی پر رہ جائیں ــــ یہ تمہارے لئے اور اہل قافلہ کے لئے سامان زیست ہے سو تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، جس کی خاطر تم ہر طرف سے کھینچ کر اس مرکز میں جمع ہوتے ہو۔

(۴) حلال جانوروں میں سے جس پر اللہ کا نام لیا جائے وہ حلال ہے جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے وہ حلال نہیں۔ سورۃ انعام میں ہے۔ **فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ** (۶/۱۱۹) اے جماعت مومنین! جس جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا جائے اسے کھاؤ۔ یہ قوانین خداوندی پر تمہارے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد ہے۔ **وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ** (۶/۱۲۰) "جب خدا نے تمہیں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ کون کون سی چیزیں حرام ہیں تو جن چیزوں کو اس نے حلال وطیب قرار دیا ہے ان پر اللہ کا نام لے کر کھانے میں کیا تردد ہوسکتا ہے؟ (انہیں اگر خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہے)۔ اس کے بعد ہے۔ **وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ** (۶/۱۲۲) "جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ حلال نہیں"۔ ان احکام سے واضح ہے کہ :-

(۱) حلال جانوروں میں سے بھی انہی کا گوشت حلال ہے جن پر اللہ کا نام لیا جائے۔

(۴) جن پر غیر اللہ کا نام لیا جائے وہ بھی حرام ہیں اور جن پر اللہ کا نام نہ لیا جائے (خواہ کسی اور کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے) وہ بھی حرام ہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے حلال کے ساتھ طیّب بھی کہا ہے۔ (حَلٰلًا طَيِّبًا - ۲/۱۶۸) طیّب کے معنی ہیں خوشگوار، ذوق اور پسند کے مطابق۔ یا صحت کے لحاظ سے مناسب۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ضروری نہیں کہ انسان ہر حلال چیز بالضرور کھائے۔ حلال چیزوں کے کھانے کی ممانعت نہیں۔ ان میں سے جو مناسب اور پسند ہوں انہیں کھایا جائے جو ناپسند یا ناموافق ہوں انہیں بیشک نہ کھایا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تم انہیں حرام سمجھ لو۔ وہ حلال ہی ہیں صرف تمہارے نزدیک طیّب نہیں۔

(۶) جس طرح حرام کو حلال قرار دینے کا اختیار کسی کو نہیں، اسی طرح، حلال کو حرام قرار دینے کا بھی حق کسی کو نہیں۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح آئی ہے۔ (مثلاً) سورۃ مائدہ میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا - اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ - وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ - (۵/۸۷-۸۸)

اے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا کہ جن خوشگوار چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے، انہیں اپنے اوپر حرام قرار دے لو۔ نہ ہی یہ کہ جن چیزوں پر اس نے پابندیاں عائد کی ہیں، تم ان پابندیوں کو توڑنے لگ جاؤ۔ حد سے گزر جانا، یعنی افراط و تفریط، دونوں اطراف میں بُرا ہوتا ہے۔

حق کی راہ یہ ہے کہ تم، قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو اور اس طرح جو کچھ اللہ نے سامانِ رزق عطا کیا ہے اسے حلال و طیّب طریق سے کھاؤ پیو اور یوں اس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

سورۃ یونس میں ہے:-

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا - قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ - (۱۰/۵۹)

ان سے پوچھو کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے جو سامانِ رزق پیدا کیا ہے۔ تم اس میں سے خود ہی (اپنے معتقدات کے مطابق، کسی کو حلال قرار دیتے ہو، کسی کو حرام۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے

تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ تم خود ہی حرام وحلال کے فیصلے کرنے لگ جاؤ؟) حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے آپ ہی کچھ فیصلے کر لیتے ہو اور پھر انہیں شریعت کا نام دے کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔ یہ بہت بڑا افترا ہے؛

سورۃ النحل میں ہے:۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (۱۶/۱۱۶)

اور دیکھو! ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبان پر جو بات جھوٹی آجائے اسے بے دھڑک بیان کر دیا کرو اور یونہی کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام۔ (حلال وحرام کے تعین کا اختیار صرف خدا کو ہے۔ اور اس نے اپنی کتاب میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ اس کے بعد اپنی طرف سے حلال اور حرام کی فہرستیں مرتب کرنا، خدا کے خلاف افترا پردازی ہے اور جو لوگ خدا کے خلاف افترا کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

سورۃ اعراف میں بڑی تحدی سے کہا کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔ (۷/۳۲)۔ "ان سے پوچھو کہ زیب و زینت کا سامان یا خوشگوار کھانے پینے کی چیزیں جنہیں خدا نے حلال قرار دیا ہے، وہ کون ہے جو انہیں حرام قرار دے سکے؟" گویا خدا کے حلال قرار دادہ کو حرام قرار دینا، خدائی اختیارات میں شریک ہونا ہے۔ اس لئے اس کا حق کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ حرام قرار دیا جانا مقصود تھا، اسے خدا نے اپنی کتاب میں وضاحت سے بتا دیا۔ اس کے علاوہ ہر شے حلال ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ انہیں حرام قرار دیدے!

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، حلال چیزوں میں سے جو کسی کو پسند نہ ہو، یا اس کے مزاج کے موافق نہ ہو، اسے بیشک نہ کھایا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے، اس شخص پر یا کسی اور پر حرام ہو گئی ہے۔ اسی طرح، اسلامی مملکت بعض مصالح کی بنا پر، بعض چیزوں کے کھانے پینے پر پابندی عاید کر دیتی ہے۔ اس سے بھی وہ شے حرام نہیں ہو جاتی۔ اسے حلال پر وقتی پابندی کہا جائے گا۔

لیکن — جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے — نبی اکرمؐ کو اپنے آپ پر اس قسم کی پابندی لگانے سے بھی منع کر دیا۔ حضورؐ نے کسی (حلال) چیز کے نہ کھانے کی اپنے اوپر پابندی عاید کر لی۔ اس پر ارشادِ خداوندی ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ

تَحِيْمٌ - قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ - وَاللّٰهُ مَوْلٰكُمْ - وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ - (۶۶/۲-۱)

اے نبی! جس چیز کو خدا نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے، تم نے، اپنی بیویوں کی رضامندی کی خاطر، اسے نہ کھانے کی اپنے اوپر پابندی کیوں عائد کرلی؟ (یہ تنبیہہ اس لئے کی گئی ہے کہ) تم پر خدا کی طرف سے سامانِ حفاظت وربوبیت کی کمی نہ ہو۔ نیز اس لئے بھی کہ تیرے کسی عمل کا اثر، تیری اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ تم کسی چیز کو، محض طبیعت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے چھوڑ دو اور تیرے متبعین یہ سمجھ لیں کہ یہ چیز فی ذاتہٖ بُری ہے اس لئے وہ بھی اسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیں۔ تمہیں اس لئے بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے)

(اگر تم نے اس بارے میں کوئی قسم کھالی ہے، تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں) قانونِ خداوندی نے اس قسم کی قسموں کو توڑ دینے کے لئے کفارہ مقرر کر رکھا ہے۔ (۲/۲۲۵-۵/۸۹)۔ اللہ تمہارا کارساز ہے (اس لئے اس نے اپنے قانون میں اس کی گنجائش رکھی ہے کہ جو باتیں سہو وخطا کی وجہ سے سرزد ہو جائیں۔ ان کا تدارک آسانی سے ہو سکے۔ وہ انسانوں کی طبیعت کی کمزوری سے) واقف ہے، اس لئے اس نے اپنے قانون کو حکمت پر مبنی رکھا ہے۔

یہ اس لئے کہ حضورؐ نے تو کسی ذاتی وجہ کی بنا پر اس چیز کے نہ کھانے کی پابندی اپنے اوپر عائد فرمائی تھی، لیکن اس سے اس کا امکان تھا کہ بعد میں آنے والے، اسے حرام ہی سمجھ لیتے۔ اس احتیاط کی بنا پر حضورؐ کو اس سے روک دیا گیا۔ اس سے پہلے ایسا ہو چکا تھا حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) نے کسی حلال چیز کو نہ کھانے کی اپنے اوپر پابندی عائد کرلی۔ اور بنی اسرائیل نے سمجھ لیا کہ وہ حرام ہو گئی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ "حرام وحلال" کا سوال اس قدر اہم ہے کہ جس چیز کو خدا نے حلال کیا ہے اسے حرام قرار دینا تو ایک طرف، ایسے حالات پیدا کر دینا جن سے اسے حرام سمجھ لیا جائے، اور تو اور نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں تھا کسی شے کو حرام قرار دینے کے معنی ہیں انسانی آزادی پر ابدی پابندی لگا دینا۔ اور ظاہر ہے کہ (قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کی رُو سے) اس کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

اضطراری حالت

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ قرآن مجید میں حرام چیزوں کی تفصیل دینے کے بعد کہا گیا ہے کہ اضطراری حالت میں، ان میں سے کسی چیز کو بقدرِ ضرورت کھایا جا سکتا ہے۔ "اضطراری حالت" کا

مطلب واضح ہے۔ یعنی اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ انسان بھوک سے مر رہا ہو اور کوئی حلال چیز دستیاب نہ ہو سکتی ہو تو اس وقت صرف جان بچانے کی خاطر، حرام اشیاء بقدرِ ضرورت کھائی جا سکتی ہیں۔ قرآن مجید نے حرام میں استثنا صرف اس مقام پر کیا ہے۔ اور کسی حرام چیز میں اس قسم کی استثنا نہیں کی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کسی اور معاملہ میں قرآن اضطراری حالت تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اگر یہ اصول وضع کر لیا جائے کہ عندالضرورت ہر حرام فعل حلال اور ہر ناجائز کام جائز ہو جاتا ہے تو حلت و حرمت اور جائز و ناجائز کی تفریق ہی ختم ہو جائے۔ اس کی دو تین مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

(۱) سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے کہا ہے کہ۔

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۵۸ء)

ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں جنہوں نے اس قسم کا فتویٰ دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنے کی کہیں بھی اجازت نہیں دی۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ "عملی زندگی کی بعض ضرورتوں" کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے تو جھوٹ نہ کوئی برائی رہے گی نہ جرم۔ اس لئے کہ کوئی شخص بلا ضرورت جھوٹ نہیں بولتا۔ جب آپ کسی سے کہیں کہ تم نے جھوٹ بولا ہے تو اس کا بیساختہ جواب یہ ہوتا ہے کہ "مجھے کیا ضرورت تھی جو میں جھوٹ بولتا" جھوٹ بولنا تو ایک طرف، ہر مجرم اپنے جرم کے ارتکاب کے سلسلہ میں "ضرورت" کی دلیل پیش کرتا ہے۔ خواہ یہ ضرورت مادی ہو، اور خواہ جذباتی۔

لہٰذا حرام چیزوں کے کھانے کے سلسلہ میں اضطراری حالت کی آڑ میں ہر حرام کو عندالضرورت حلال اور ہر ناجائز کو بوقت ضرورت جائز قرار دیدینا، قرآن کریم کی کھلی مخالفت ہے۔ اس کے بعد خدا کی مقرر کردہ حدود و قیود کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

(۲) جب صدر ایوب (مرحوم) کے دورِ حکومت میں صدارت کے لئے محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) بطور امیدوار کھڑی ہوئیں تو جماعتِ اسلامی نے ان کی تائید کرنے کا فیصلہ کیا۔ مودودی صاحب اس سے پہلے فیصلہ دے چکے تھے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ عورت سیاسیات میں حصہ لے۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ محترمہ مس فاطمہ جناح کا منصب صدارت پر فائز ہو جانا اسلام کی رُو سے کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے اور جماعت اسلامی ان کی

تائید کس طرح کر سکتی ہے؛ اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ۔

کافی غور اور مشورہ کے بعد جماعت جس نتیجہ پر پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقعہ پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی حرمت ان حرمتوں میں سے نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں میں ہی اس کا شمار ہو سکتا ہے۔

(پمفلٹ شائع کردہ جماعت اسلامی)

حرمتوں کی یہ تقسیم (کہ بعض ابدی اور قطعی ہیں اور بعض قابلِ تغیر و تبدل) یکسر قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس لئے حرمتوں کے متعلق کہیں ایسی تفریق نہیں کی۔ اس کے نزدیک ہر حرام ابدی اور قطعی حرام ہے۔ اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت کے بھی یہ معنی نہیں کہ ان چیزوں کی حرمت حلت میں بدل جاتی ہے وہ بدستور حرام رہتی ہیں۔ صرف اس شخص کو جس پر اضطراری حالت طاری ہو، ان کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے اور یہ اجازت خود خدا نے دی ہے۔ اسلامی حکومت بھی کسی حلال شے کو غیر طیب قرار دے کر اس کے استعمال پر وقتی طور پر پابندی عائد کر سکتی ہے (جیسے برسات یا وبائی امراض کے زمانے میں بعض پھلوں کے کھانے پر پابندی لگا دی جاتی ہے)، لیکن خدا کے حرام کردہ یا ناجائز قرار دادہ کو حلال وہ بھی قرار نہیں دے سکتی۔

ہم نے ان امور کی وضاحت اس لئے ضروری سمجھی ہے کہ مودودی صاحب کے ان فیصلوں کی رُو سے عوام میں حلال اور حرام کا تصور بدل رہا ہے۔ اور جن لوگوں پر خدائی پابندیاں گراں گزرتی ہیں، ان تعبیرات سے انہیں ہر قسم کی چھوٹ حاصل ہو جاتی ہے۔

خمر

خمر، اشیائے خورد و نوش میں سے نہیں اس لئے اس کا ذکر حرام کی فہرست میں نہیں آیا۔ لیکن اس کے استعمال سے بڑی سختی سے روکا گیا ہے۔ چونکہ نشہ کی عادت، ایک دن میں نہیں چھڑائی جا سکتی اس لئے اس باب میں تدریجاً احکام دیئے گئے۔ پہلے کہا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (۴/۴۳) اے جماعتِ مومنین! تم نشہ کی حالت میں صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ۔ صلوٰۃ میں تمہیں معلوم ہونا

چاہیئے کہ تم کیا کر (اور کیا کہہ) رہے ہو؟" اس کے بعد فرمایا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۚ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۖ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ..... (۲/۲۱۹)

اے رسولؐ! تم سے خمر اور میسرہ کی بابت پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان میں کچھ فائدہ بھی ہے اور مضرت بھی لیکن ان کی مضرت، ان کے فائدہ سے کہیں زیادہ ہے۔

اور آخر میں کہا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔ (۵/۹۰-۹۱)

خمر، میسرہ، انصاب، ازلام (جن کا ذکر ۲/۲۱۹ و ۵/۳ میں آچکا ہے) ایسے کام ہیں جن سے معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں ماؤف ہوجاتی ہیں (۵/۹۰)۔ لہٰذا، تم ان سے اجتناب کرو تاکہ یہ تمہاری کامیابی کے راستے میں روڑا بن کر نہ اٹک جائیں۔

اگر تم اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے خمر اور میسرہ جیسی عادات پر اتر آئے تو یہ چیزیں (انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ) تم میں باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گی، اور قوانینِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنے اور نظامِ صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گی۔

کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں رہو گے؟

اس سے خمر پر ممانعت عائد ہوگئی۔ ان تدریجی احکام سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ قوانین کا نفاذ معاشرہ کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ اس میں افرادِ معاشرہ کی عام ذہنی اور نفسیاتی حالت بھی آجاتی ہے۔

(۲) خمر کے معنی ہیں ہر وہ چیز جو انسان کی عقل کو ڈھانپ لے۔ اس لفظ کا عام استعمال تو "شراب" کے لئے ہوتا ہے لیکن اس زمرہ میں دیگر نشہ آور اشیاء بھی شامل کی جاسکتی ہیں۔ مملکت کے قانون میں خمر کی تعریف اس طرح دی جانی چاہیئے کہ بات بالکل واضح ہوجائے کہ کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ جب اسے قانونی حیثیت دی جائے گی تو خمر کی تعریف (DEFINITION) دینا لازمی ہوگا۔

معاشرتی احکام

(۸)

معاشرتی احکامات عام طور پر قانون کے دائرے میں نہیں آتے۔ لیکن اگر معاشرہ میں کوئی معاشرتی خرابی عام ہوجائے تو اسلامی حکومت اس سے متعلق معاشرتی حکم کو بھی قانونی حیثیت دے سکتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ذیل میں چند اہم معاشرتی احکام درج کیئے جاتے ہیں۔ (معاشرتی احکام کی تفصیل میری کتاب "اسلامی معاشرت" میں ملے گی)۔

۱۔ اخراجات میں اعتدال

(۱) کھاؤ پیو لیکن اسراف مت کرو۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ (۷/۳۱)

(۲) بلا ضرورت صرف نہ کرو۔ اسے تبذیر کہتے ہیں۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔ (۱۷/۲۶-۲۷)۔ "بیجا صرف نہ کرو۔ ایسا کرنے والوں کا شمار شیطان کے بھائیوں میں ہوتا ہے۔"

۲۔ وضع قطع

(۱) زیب و زینت کی چیزوں کا استعمال حلال ہے۔ اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ تفصیل حلال و حرام کے عنوان میں گزر چکی ہے۔ (۷/۳۲)

(۲) لباس سے مقصد ستر پوشی بھی ہے اور دیدہ زیبی بھی۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا

يُوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ..... (۲۶)

۳۔ جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں

علم (ذہنی صلاحیت) اور جسمانی قوت دونوں ضروری ہیں۔ جب (حضرت) طالوت کو بنی اسرائیل کا کمانڈر مقرر کیا گیا تو انہوں نے اعتراض کیا کہ وہ کوئی دولتمند شخص نہیں۔ اسے کس خصوصیت کی بنا پر کمانڈر مقرر کیا گیا ہے۔ اس پر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ (۲۴۷)۔ جنگ کی کمان کے لئے مال و دولت معیار نہیں ہوا کرتا۔ اس کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا علم کس قدر ہے اور جسمانی توانائی کا کیا حال ہے۔ طالوت کو یہ کچھ فراوانی سے میسر ہے۔ اس لئے اس کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہے۔

۴۔ گفتگو

(۱) ہمیشہ صاف۔ سیدھی۔ دوٹوک بات کرو جس میں ابہام نہ ہو۔ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۔ (۳۳)۔

(۲) ایسی زبان استعمال کرو جو معاشرہ میں معروف اور مانوس ہو۔ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۵)۔ نیز ایسا انداز کلام اختیار کرو جس میں حسن پایا جائے۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ (۲)۔

(۳) پُر از مکر و فریب اور تصنع آمیز گفتگو مت کرو۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ (۲۲)۔

(۴) بات کرو تو عدل و انصاف کی کرو۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔ (۶)۔ جب بات کرو تو عدل و انصاف کو ملحوظ رکھو خواہ یہ چیز تمہارے کسی رشتہ دار تک کے بھی خلاف کیوں نہ جائے۔

(۵) چیخ چیخ کر مت بولو۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ۔ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔ (۳۱)" نرم دم گفتگو رہو۔ گدھے کی طرح چیخ چیخ کر بات نہ کرو۔ ایسی آواز سننے والوں کی طبیعت پر سخت گراں گزرتی ہے"

۵۔ لغو اور بے حیائی کی باتیں

ہر قسم کی لغویات سے مجتنب رہو۔ مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ۔ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳) "وہ لغویات سے اجتناب کرتے ہیں" لغو، بیہودہ کے علاوہ بے معنی باتوں کو بھی کہتے ہیں۔ سورہ انعام میں لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ (۶) کہا گیا ہے۔ اس میں بے حیائی کے جملہ امور آجاتے ہیں خواہ وہ اس قسم کی باتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ فحاشی

کے جذبات تو بیدار ہی ان چیزوں سے ہوتے ہیں۔

۶۔ رفتار

(۱) اکڑ کر مت چلو۔ میانہ روی کی چال اختیار کرو۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۔۔۔ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ ۔۔۔۔ (۳۱/۱۸-۱۹)۔ (نیز ۱۷/۳۷)۔

(۲) باہر نکلو تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو۔ (یہ حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہے) پہلے مردوں کے متعلق ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ (۲۴/۳۰)۔ اور پھر عورتوں کے متعلق ہے وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ۔ (۲۴/۳۱)۔

سوچنا سمجھنا۔

(۱) بلا تحقیق کسی بات کے پیچھے مت لگ جاؤ۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶)۔

اور یاد رکھو! جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو (جس کی خود تحقیق نہ کر لو) اُس کے پیچھے مت لگو۔ (ذاتی تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ) تم اپنی سماعت و بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور پھر ان معلومات کی بنا پر اپنے ذہن سے فیصلہ کرو۔ اور اس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچو۔ ان میں ایک کڑی بھی گم ہو گئی تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائے گی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ (اس لئے کہ خدا نے تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ مجبور مشین نہیں بنایا۔ اور اس اختیار کے استعمال کے لئے، ذرائع علم و تحقیق عطا کر دیئے ہیں۔ ان سے کام نہ لینے والا اپنی ذمہ داری سے جی چراتا ہے)۔

یہ بڑا اہم حکم ہے۔ اگر معاشرہ اس پر عمل کرنے لگ جائے تو فتنہ پردازوں کی اکثر و بیشتر سازشیں ناکام رہ جائیں اور معاشرہ میں سکون کی فضا پیدا ہو جائے۔

(۲) ہمیشہ غور و فکر کرو۔ ہر چیز کو اچھی طرح سے دیکھو۔ سنو۔ سمجھو اور پھر عقل و فکر کی رو سے کسی فیصلہ پر پہنچو۔ دیکھئے! ایسا نہ کرنے والوں کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ فرمایا۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۔ (۷/۱۷۹)۔

اور انسانوں کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ ــــ مہذب اقوام ہوں، یا جاہل بادیہ نشین ــ ان کا اندازِ زیست ان کے اہلِ جہنم ہونے کی علامت بن جاتا ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے ۔ اُن کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے ۔ وہ کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں ۔ یہ لوگ انسان نہیں ، بالکل حیوان ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ ۔ (اس لئے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلّی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں ۔ اور اِس قسم کے انسان ، ان حدود سے بھی) بے خبر رہتے ہیں ۔"

(۳) اچھی بات سنو تو اس پر عمل کرو ۔ لغویات سنو تو اس سے پرہیز کرو ۔ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۔ (۲/۲۸۵) "ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے" مومنین کا شیوہ بتایا گیا ہے ۔" اور یہ بھی کہ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ ۔ (۲۸/۵۵)۔ جب وہ کوئی لغویات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں ۔"

ٹوہ میں نہ لگے رہو۔

دوسروں کی ان باتوں کی ٹوہ میں نہ لگے رہو جن کا تم سے کوئی تعلق نہ ہو ۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا ۔ (۴۹/۱۲)۔

علم۔

(۱) علم والا اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے ۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹/۹) "ان سے پوچھو کہ کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو علم نہیں رکھتے ۔"

(۲) علم کی دنیا میں یہ کبھی نہ سمجھو کہ تم آخری حد تک پہنچ گئے ہو اور تم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ۔ یاد رکھو ۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۔ (۱۲/۷۶)۔ "ہر صاحب علم سے بالا اور صاحب علم بھی ہوتا ہے ۔" نہ ہی یہ کہو کہ اب مجھے کچھ اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ۔ میرے علم کا پیمانہ لبالب بھر چکا ہے ۔ اس قسم کی ذہنیت کفار کی بتائی گئی ہے ۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۔ (۲/۸۸) ۔ جو کہتے ہیں کہ "نہ ہمارے دلوں کو اس کی ضرورت ہے کہ باہر کی کوئی بات ان تک پہنچے نہ ہی ان میں مزید کچھ داخل ہونے کی گنجائش ہے ۔" اس باب میں، اور تو اور، خود حضورؐ نبی اکرم سے کہا گیا کہ وہ

خدا سے دعا مانگتے رہا کریں کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ (۲۰/۱۱۴)۔ "اے میرے نشوونما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کرتے جاؤ۔"

معاشرتی روابط

جب ایک دوسرے سے ملو تو سلامتی کی دعاؤں اور نیک آرزوؤں کے ساتھ ملو۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا۔ (۴/۸۶)۔ "جو تمہارے لئے زندگی اور سلامتی کا پیغام اور سامان بہم پہنچائے، تم اُس کے لئے، اس سے بہتر اور حسین تر، حیات بخش پیغام اور سامان بہم پہنچاؤ۔ اور اگر ہنوز حالات ایسے سازگار نہ ہوں کہ تم اسے، اس کی پیش کش سے زیادہ دے سکو، تو کم از کم اُسے اتنا ہی لوٹا دو۔"

تم خواہ اپنے گھر جاؤ یا کسی اور کے، اہلِ خانہ سے سلام کہو۔ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّۃً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَۃً طَیِّبَۃً۔ (۲۴/۶۱)۔ "(جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے (۲۴/۲۷)، جب تم دوسروں کے ہاں جاؤ تو اندر جانے کی اجازت لو۔ اور پھر) اپنے ان لوگوں کے لئے سلامتی اور ایسی پاکیزہ زندگی کی آرزو کا اظہار کرو جو خدا کی طرف سے، صد برکات کا موجب اور ہزار خوشگواریوں کا باعث ہو۔

حسنِ سلوک

(۱) والدین، اقرباء، یتامیٰ، مساکین، ہمسایوں، دوستوں اور مسافروں کے ساتھ اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ (۴/۳۶)۔ اس آیت میں "مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ" کے معنی غلام اور لونڈیاں ہی نہیں۔ اس میں تمام وہ لوگ آجاتے ہیں جو کسی کے ماتحت کام کرتے ہوں۔

(۲) اس حسنِ سلوک کے معاوضہ کی خواہش نہ کرو حتیٰ کہ شکریہ تک کی بھی نہیں۔ ان سے کہہ دو کہ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹)۔ "اس کا بدلہ تو ایک طرف، ہم اس کے بھی متمنی نہیں کہ تم ہمارا شکریہ تک بھی ادا کرو۔" یہ ہمارا فریضہ تھا جسے ہم نے ادا کر دیا۔ اس کا شکریہ کیا؟

تعاون

اچھی باتوں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ بری باتوں میں تعاون مت کرو۔ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔ (۵) ۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

میل جول

لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ ۔ (۳۱/۱۸)۔

وعدہ

ہمیشہ وعدہ پورا کرو۔ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۔ (۱۷/۳۴) "اپنا عہد پورا کرو۔ یاد رکھو۔ اس کی بابت تم سے پوچھا جائے گا۔"

دوسروں کے ہاں جانا

دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت مت جاؤ۔ اس باب میں قرآنِ کریم نے بڑی تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۔ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۔ (۲۴/۲۷-۲۹)

اے جماعتِ مومنین! جب تم اپنے گھر کے سوا کسی اور کے ہاں جاؤ، تو پہلے ان سے اجازت طلب کرو اور جب وہ اجازت دے دیں تو اندر جاؤ اور تمام اہل خانہ کو سلامتی کی دعائیں دو، اور ان کے لئے نیک آرزوئیں لے کر جاؤ۔

ان آداب معاشرت کی نگہداشت تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تمہارا معاشرہ، انسانی روابط کے عمدہ ترین اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

اور اگر تم دیکھو کہ اُس گھر میں کوئی نہیں، تب بھی اس کے اندر نہ جاؤ ۔ کوئی شکل بھی ہو، دوسروں کے گھروں میں صرف اس صورت میں داخل ہو جب تم کو اسکی اجازت مل جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ آپ اس وقت تشریف لے جائیں، تو دل میں کوئی گرانی محسوس کئے بغیر، واپس آجاؤ۔

ان امور کی نگہداشت سے تمہارے حالات سنورے رہیں گے۔ اللہ کا قانون تمہاری ہر بات کا اچھی طرح علم رکھتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسے مکانات میں بلا اجازت داخل ہو جاؤ جن میں کوئی بستا نہیں۔ اور ان میں تمہارا سامان رکھا ہے۔ (جیسے گودام وغیرہ۔ لیکن اگر وہ مشترکہ گودام ہے اور اس میں تم اکیلے داخل ہو رہے ہو، تو تمہارے دل میں کسی قسم کی بددیانتی کا خیال نہیں آنا چاہیئے۔) یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات اچھی طرح جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے ہو اور دل میں کیا چھپاتے ہو۔

آدابِ محفل

(۱) نشست و برخاست میں آدابِ محفل ملحوظ رکھو۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ (۵۸/۱۱)۔

(اے جماعتِ مومنین! یہ منافقین جب تمہاری مجلس میں آتے ہیں تو باہمی سرگوشیوں کے لئے، ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا) جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کشادہ ہو کر بیٹھو، تو فوراً ایک دوسرے سے الگ ہو کر بیٹھ جایا کرو۔ (اس طرح انہیں بھی ایک دوسرے سے ہٹ کر بیٹھنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں خود تمہاری جماعت میں بھی کسی کو یہ شبہ پیدا نہیں ہوگا کہ اس کے خلاف کوئی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ مجلس میں بیٹھنے کا عام انداز ایسا ہی ہونا چاہیئے) اس سے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کشادگی کی راہیں کھول دے گا اور جب کہا جائے کہ مجلس برخاست ہوتی ہے اس لئے تم اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ (یہ باتیں بظاہر چھوٹی چھوٹی سی ہیں، لیکن ان کے اثرات بڑے دوررس ہوتے ہیں، اس لئے ان کی پابندی سے) اللہ ان کے درجات

بلند کر دے گا جو دل سے ان باتوں کو صحیح اور سچا مانتے ہیں اور ان کی حکمت و غایت کا علم رکھتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات تمہارے تمام اعمال سے باخبر رہتا ہے۔

(۲) کسی کے ہاں کھانے کی دعوت ہو تو پہلے ہی سے نہ جا بیٹھو۔ نہ ہی کھانے کے بعد باتوں میں لگے رہو جس سے صاحبِ خانہ کو ناحق تکلیف ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۔ (۳۳/۵۳)۔

اے جماعتِ مومنین! تم یونہی بن بلائے اور بغیر اجازت لئے، رسول کے گھر نہ چلے جایا کرو۔ اس سے اس کی پرائیویسی میں خلل آتا ہے۔ اگر وہ تمھیں کھانے کے لئے بلائے تو اس کے ہاں جاؤ لیکن وہ بھی اس طرح نہیں کہ تم کھانا پکنے سے پہلے ہی وہاں جا بیٹھو اور کھانے کا انتظار کرتے رہو۔ جب کھانا تیار ہو جائے اور وہ تمھیں بلائے تو پھر اندر جاؤ۔ اور جب کھانا کھا چکو تو وہاں سے چلے جاؤ۔ وہیں بیٹھے باتوں میں نہ لگ جاؤ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اسے تکلیف ہو گی، لیکن وہ تمھیں، شرم کی وجہ سے، کہیگا نہیں۔ لیکن اللہ تو حق بات کہنے سے نہیں شرماتا (اس لئے اس نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے)

ضمناً، غور فرمایئے کہ جس معاشرہ میں نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی تھی۔ اس کی عام تمدنی سطح بھی کس قدر پست تھی کہ انہیں اس قسم کے روزمرہ کے آداب بھی خصوصیت سے سکھانے پڑتے تھے۔ لیکن چند سالوں کی تعلیم و تربیتِ نبوی کا نتیجہ تھا کہ وہی لوگ نہ صرف روم اور ایران کی تہذیبوں کے مصلح بن گئے بلکہ یورپی اقوام تک کو بھی انہوں نے آدابِ زیست سکھائے۔

حسد

دوسروں سے حسد نہ کرو۔ اسے قابلِ مذمت ذہنیت یا خصلت قرار دیا گیا ہے جب کہا کہ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۔ (۴/۵۴)۔ "اللہ نے جو کچھ انہیں اپنے فضل و کرم سے عطا کیا ہے یہ لوگ اس پر حسد کرتے ہیں"۔

غیبت

کسی کی غیبت مت کرو۔ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ (۴۹/۱۲)۔

نام رکھنا

دوسروں کے الٹے پلٹے نام مت رکھو۔ نہ ہی ایک دوسرے کے خلاف کوئی عیب لگاؤ۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ۔ (۴۹/۱۱) تم ایک دوسرے کے خلاف عیب نہ لگاؤ۔ نہ طعن و تشنیع کرو اور نہ ہی ایک دوسرے کے اُلٹے پلٹے نام رکھو۔ جب تم ایمان لاکر بلند اخلاق کے حامل بننے کا تہیہ کر چکے ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے بُرے نام رکھنے سے کیا مطلب؟ یہ بُری بات ہے۔"

تمسخر

کسی سے تمسخر نہ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ۔ (۴۹/۱۱)

اے جماعتِ مومنین! ایسا نہ کرو کہ تم میں ایک فریق دوسرے فریق کا مذاق اڑانے لگ جائے اور اسے ذلیل اور حقیر کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تمہارے لوگوں سے بہتر ہوں — نہ تمہارے مرد ایسا کریں، نہ عورتیں۔

تشہیر

سوائے اس کے کہ تم پر کوئی زیادتی ہوئی ہو، کسی بات کی تشہیر مت کرو۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (۴/۱۴۸) خدا کسی بات کی تشہیر کو پسند نہیں کرتا، بجز اس کے کہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوئی ہو۔"

بدظنی

بدظنی سے بچو۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ (۴۹/۱۲) جب باہمی اختلاف ہوجاتے تو اس سے فتنہ پرور لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور فریقین میں لگائی بجھائی کی باتیں کرتے ہیں۔ تم اس باب میں بڑے محتاط رہو۔ تم ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لو اور) بدگمانی سے اجتناب کرو بعض بدگمانی تو ایسی ہوتی ہے کہ وہ جرم اور گناہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

دین سے مذاق

دین کا معاملہ بڑا اہم اور نازک ہے۔ جو لوگ اسے (SERIOUSLY) نہیں لیتے ان کی محفل تک میں مت بیٹھو۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَ یُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖۤ٘ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ (۴/۱۴۰)

فریقِ مخالف (کفار) کے ساتھ دوستی کے تعلقات تو ایک طرف رہے، خدا نے اپنے ضابطۂ قوانین میں، اس باب میں، حکم یہ دیا ہے کہ جب تم دیکھو کہ آیاتِ خداوندی کا انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے، تو تم ایسی مجلس میں بھی نہ بیٹھو۔ ان سے کنارہ کش ہو جاؤ تاآنکہ وہ اس قسم کی باتیں چھوڑ کر دوسری باتوں میں نہ لگ جائیں۔ اگر تم ان کی اس قسم کی باتوں میں شریکِ محفل رہے تو اس وقت تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ حالانکہ تم میں اور ان میں کوئی چیز وجہِ جامعیت نہیں ہو سکتی۔

ایسے لوگوں سے قطع تعلق کرلو۔ وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا۔ (۶/۷۰) جن لوگوں کی یہ حالت ہو کہ وہ (نظامِ خداوندی تو ایک طرف) خود اس آئین اور ضابطہ کو بھی کچھ اہمیت نہ دیں جسے انہوں نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے اور انسانی زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھیں، ان سے الگ ہو جاؤ۔

کج بحثی

کج بحثی مت کرو۔ اپنی بات دلائل و براہین اور حکمت و موعظت سے پیش کرو۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ (۱۶/۱۲۵)۔ اپنے خدا کے راستے کی طرف

حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دیتے چلے جاؤ۔ یعنی قوانین خداوندی کی غرض و غایت اور اخلاقی اقدار کے منشاء و مقصود کو سامنے رکھتے ہوئے ۔۔۔ اور اختلافی امور میں، ان کے ساتھ نہایت حسن کارانہ انداز سے بات چیت کرو۔"

غصّہ

یونہی مغلوب الغضب نہ ہو جاؤ۔ اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ (۳/۱۳۴) یعنی غصّہ کے وقت ضبط سے کام لینے والے۔

معاف کر دو

جو نادانی سے کوئی غلط بات کر بیٹھے اور پھر اپنے کئے پر نادم ہو، اور تم سمجھو کہ اسے معاف کر دینے سے اس کی اصلاح ہو جائے گی تو اسے معاف کر دو۔ اَنَّہٗ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۶/۵۴)۔

اپنی اصلاح

(۱) دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشش ضرور کرو لیکن اپنی اصلاح مقدم سمجھو۔ یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ۔ (۲/۴۴)۔ تم دوسروں کو تو نیک کاموں کی تلقین کرتے اور حکم دیتے ہو اور اپنی خبر ہی نہیں۔

(۲) "اپنی اصلاح" میں ان سب کی اصلاح شامل ہے جو تمہارے متعلقین ہیں۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ (۶۶/۶)۔ "اپنے آپ کو بھی جہنم کی آگ سے بچاؤ اور اپنے متعلقین کو بھی۔

اپنی نیکی کی دھونس نہ جماؤ

لوگوں پر اپنی نیکی اور پاک بازی کی دھونس نہ جماؤ۔ وَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۔ (۵۳/۳۲)۔ اپنے آپ کو متقی اور پرہیزگار مت کہتے پھرو۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تم میں سے کون

مستقی ہے۔

منافقت۔

دل میں کچھ اور، زبان پر کچھ اور۔ یہ بدترین خصلت ہے۔ منافقین کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ (۳/۱۶۶)۔ "وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔" ان کی زبان ان کے دل کی ترجمان نہیں ہوتی۔

افواہیں

(۹)

(۱) افواہیں مت پھیلاؤ۔ جب کوئی ایسی بات سنو جس کا تعلق تمہاری اجتماعی زندگی سے ہے تو اسے ذمہ دار حکام تک پہنچا دو تاکہ وہ مناسب تحقیق و تفتیش کے بعد صحیح نتائج تک پہنچ سکیں۔

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ۔ (۴/۸۳)

(فتنہ پردازوں کی روش یہ ہے کہ) جب وہ کہیں سے امن یا خوف کی کوئی اڑتی ہوئی سی بات سن پاتے ہیں تو اسے لے دوڑتے ہیں اور خوب پھیلاتے ہیں۔ حالانکہ نظام سے وابستگی اور اطاعت کا تقاضا ہے کہ ایسی باتوں کو رسول (مرکزی اتھارٹی) یا اپنے افسرانِ ماتحت تک پہنچا دیا جائے تاکہ وہ لوگ جو بات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرلیں۔

دوسرے مقام پر ہے:۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوٓا إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا أَن تُصِيبُوا قَوْمًۢا بِجَهَٰلَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَٰدِمِينَ۔ (۴۹/۶)

اے رسولؐ! اپنی جماعت سے یہ بھی کہہ دو کہ جب کوئی مفسدہ پرداز تمہارے پاس کسی معاملہ کی خبر لائے تو فوراً اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو۔ اس کی تحقیق کرلیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم بلاتحقیق کوئی ایسا قدم اٹھالو جس سے کسی کو

محض تمہاری جہالت کی وجہ سے نقصان پہنچ جاتے، اور اس کے بعد تمہیں، اپنے کئے پر خود ہی پچھتانا پڑے۔"

(۲) جب کسی کے خلاف کوئی بات سنو تو تمہارا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ یہ بہتان ہے۔ سورۃ النور میں ایک واقعہ کا ذکر ہے جس میں فتنہ پرور لوگوں نے کسی عفت مآب خاتون کے خلاف بہتان تراشی سے ایک بات اڑا دی اور وہ معاشرہ میں پھیل گئی۔ قرآنِ کریم نے اس کا بڑی سختی سے نوٹس لیا اور کہا کہ۔ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔ (۲۴/۱۲) "جب تم نے اس بات کو سنا تھا تو ایک دوسرے کے متعلق حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ یہ تو بالبداہت تہمت نظر آتی ہے؟"

آگے چل کر کہا:۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ۔ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (۲۴/۱۵-۱۶)

حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس معاملہ کی اہمیت کا احساس ہی نہیں کیا۔ اسے یونہی معمولی بات سمجھتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم نے اس بات کو سنتے ہی زبانوں پر چڑھا لیا، اور اسے بلا تحقیق و تفتیش (۲۴/۱۷) آگے دہراتے چلے گئے — تم نے اسے معمولی بات سمجھ لیا حالانکہ قانونِ خداوندی کی رو سے یہ بات بڑی اہم تھی۔

جب تم نے اسے سنا تھا تو تمہیں کہنا یہ چاہیئے تھا کہ ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم اس کے متعلق کوئی بات کریں۔ یوں تو معصوم خدا کی ذات ہے۔ لیکن یہ تہمت بڑی سنگین نظر آتی ہے۔

متفرقات

(۱۰)

اذیّت رسانی

کسی کو ناحق اذیت پہنچانا جرم ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا۔ (۳۳/۵۸)۔

جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے، ایذا رسانی کا موجب بنتے ہیں اور ان پر ناکردہ گناہوں کا الزام دھرتے ہیں تو وہ بہت بڑے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ۔ (۸۵/۱۰)

جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو ایذا دیتے ہیں اور اپنی اس روش سے باز نہیں آتے، ان کے لئے سوزناک عذاب ہوگا ــــ یعنی وہ عذاب جو ان کا سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔

ظاہر ہے کہ اذیت میں جسمانی اذیت اور ذہنی اور قلبی اذیت دونوں شامل ہیں۔ بلکہ ذہنی اور قلبی اذیت تو جسمانی

اذیت سے بھی زیادہ صعوبت انگیز اور روح فرسا ہوتی ہے۔

ظلم و زیادتی

"ظلم" کی کوئی جامع فہرست مرتب نہیں کی جا سکتی۔ اصولاً یہ سمجھئے کہ ہر وہ بات جو قانونِ خداوندی کے خلاف ہو، ظلم کی شق میں آجائے گی۔ (دراصل، اس لفظ کے معنی ہوتے ہیں "جس شے کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اسے اس مقام پر نہ ہونا"۔ اس سے ظلم کا مفہوم بڑا وسیع ہو جاتا ہے)۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مظلوم کی پشت پناہ بنے اور اس کی دادرسی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا۔ (۱۷/۳۳) "جو شخص ظلم سے ناحق مارا جائے (تو قاتل یہ نہ سمجھ لے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں، اس لئے مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے) مقتول کے وارثوں کے لئے، ہم نے، نظامِ خداوندی (اسلامی معاشرہ) کو صاحبِ غلبہ و اختیار بنایا ہے۔ اس لئے یہ نظام، خود مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا"۔ اگرچہ اس آیت میں بالتصریح جرمِ قتل کا ذکر ہے لیکن اس اصول کا اطلاق ہر مظلوم پر ہوگا۔ اگر ظلم، خود حکومت کی طرف سے ہو تو اس کی دادرسی کے لئے بھی عدلیہ کا انتظام ہونا چاہیئے۔ عدل، بلا اخراجات ملنا چاہیئے کیونکہ کسی سے عدل کا معاوضہ طلب کرنا خود ظلم ہے۔ مظلوم کی دادرسی، حکومت کا فریضہ ہے۔ حکومت اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لئے مظلوم سے معاوضہ کیسے مانگ سکتی ہے؟

سازش، خفیہ مشورے

خلافِ قانون امور کے لئے خفیہ مشورے اور سازشیں جرم ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (۵۸/۹)۔

اے جماعتِ مومنین! جب تم نے باہمی مشورے کرنے ہوں، تو جرائم کے ارتکاب اور نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی کے مشورے مت کرو۔ ہمیشہ بھلائی اور تقویٰ (قوانینِ خداوندی کی نگہداشت) سے متعلق امور میں مشورے کرو۔ مختصراً یہ کہ تم ہر معاملہ میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اس لئے کہ وہی تمہاری تمام سعی و عمل کا مرکز،

اور رنگ و ناز کا منتہیٰ ہے۔ تمہاری گردش اسی محور کے گرد ہونی چاہیئے۔

افرادِ معاشرہ کے باہمی تعلقات

مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (۴۹/۱۰)۔ مومن سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اگر ان میں کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو تم ان میں صلح کرا دو۔ اور ایسا کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ یہ دونوں تمہارے بھائی ہیں۔ تمہارا فیصلہ بغیر کسی رو رعایت کے، قانونِ خداوندی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سے تمہاری جماعت مرحمتِ خداوندی کی مستحق رہے گی" اگر کبھی ان میں کسی بات پر تنازعہ ہو جائے اور نوبت لڑائی تک پہنچ جائے تو بھی ان میں صلح کرا دو اور جو زیادتی کرے، اس سے مؤاخذہ کرو۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (۴۹/۹)

اور اگر کبھی (سوءِ اتفاق سے) ایسا ہو کہ مومنین کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں فوراً صلح کرا دو۔ اگر اس کے بعد کوئی فریق، دوسرے پر زیادتی کرے، تو (یہ نہیں کہ تم بیٹھے تماشا دیکھتے رہو) تم سب مل کر اس زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف اٹھ کھڑے ہو تا آنکہ وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے جو قانونِ خداوندی کی رو سے کیا گیا تھا۔ سو اگر وہ لوگ، اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئیں تو ان میں عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو اور ہمیشہ انصاف کو ملحوظ رکھو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رو سے بڑی مستحسن ہے۔

معاشیات سے متعلق

(۱)

قرآنِ کریم میں، اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" قرار دیا گیا ہے۔ سورہ الحج میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ .... (۲۲/۴۱)۔ "یہ (مومنین) وہ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔" "ایتائے زکوٰۃ" کے معنی ہیں "زکوٰۃ دینا"۔ یعنی اسلامی مملکت کا فریضہ "زکوٰۃ دینا" ہے۔ "زکوٰۃ" کے معنی ہیں سامانِ نشوونما۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔ "نشوونما" میں افرادِ معاشرہ کی جسمانی پرورش اور انسانی صلاحیتوں کی برومندی دونوں آجاتی ہیں۔ اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے ہر فردِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہوتی رہیں اور ان کی انسانی صلاحیتیں بھی پورے پورے طور پر نشوونما پا جائیں۔ اسے "ربوبیت" کہتے ہیں۔ ربوبیتِ عالمین، خدا کی صفت ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱/۱) سے قرآن کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں اس صفتِ خداوندی کا عملی مظاہرہ، اسلامی مملکت کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ اس لئے، اس ضمن میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، ان کی ادائیگی اسلامی مملکت کے ذریعے ہوتی ہے۔

(۲) اس اصول کے مطابق، اسلامی مملکت کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس کے دائرۂ اقتدار میں کوئی ذی حیات سامانِ رزق سے محروم نہ رہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے یعنی "زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔" اس سلسلہ میں وہ مملکت افرادِ معاشرہ

کو اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ ان کے اور ان کی اولاد کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر پر عائد ہوتی ہے۔ وہ ان سے کہتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)۔ "ہم تمہارے رزق کے ذمہ دار بھی ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔" (نیز ۱۷/۳۱)۔

(۳) اسلامی معاشرہ کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ افرادِ معاشرہ مملکت سے معاہدہ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جان اور مال اس کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔" اور مملکت ان سے معاہدہ کرتی ہے کہ وہ انہیں اس کے عوض" الجنۃ " (جنتی زندگی) مہیا کرے گی۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)

جماعتِ مومنین کا نظامِ خداوندی کے ساتھ ایک عظیم معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے 'نظامِ خداوندی' ان کی جان اور مال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دیدیتا ہے (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے تمام وسائل واسباب کی فراہمی' اس نظام کے ذمے ہو جاتی ہے۔ ۲۰/۱۱۸)۔

اس جنتی زندگی میں، سب بنیادی ضروریات ــــــ روٹی۔ کپڑا۔ مکان وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے جنتِ آدم کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے:۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

اس وقت (جس نہج کی زندگی تم بسر کر رہے ہو' اس میں کیفیت یہ ہے کہ) نہ تمہیں روٹی کی فکر ستاتی ہے نہ کپڑے کی۔ نہ پیاس کا خوف ہے، نہ سورج کی تپش کا۔ (تمہارے لئے کھانے کو روٹی۔ پینے کو پانی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان۔ سب کچھ بلا مشقت موجود ہے۔)

(۴) اس معاشرہ میں، ہر شخص اپنی محنت کی کمائی میں سے 'صرف اپنی بنیادی ضروریات کے مطابق لیتا ہے اور باقی سب' دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹)۔ "اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے) کس قدر کھلا رکھیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہو وہ سب۔" (نیز ۲/۱۷۷)۔ یہ نظام' مملکت کے توسط سے قائم ہوگا کیونکہ اس "عفو" (زائد از ضرورت) کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا ہے۔ خُذِ الْعَفْوَ۔ (۷/۱۹۹)۔ "ان سے العفو وصول کر لیا کرو۔" (یہ مندرجہ بالا معاہدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے اس میں جبر کی کوئی بات نہیں) اس میں سے

وہ لوگ جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں یا جو محنت کرنے کے قابل نہیں رہتے، بطور اپنے حق کے، لیتے ہیں خیرات کے طور پر نہیں۔ وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (۵۱/۱۹) "ان کے مال میں ہر صاحبِ احتیاج اور معذور کا حق ہے۔

(۵) قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے، دولت جمع کر کے نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کی سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ۔ (۹/۳۴-۳۵)

اے رسولؐ! تم ان کے، اِن علماء و مشائخ کو، اور ان کے ساتھ، ان لوگوں کو جو (ان کی خود ساختہ شریعت) کی آڑ میں، نظامِ سرمایہ داری کو منشائے خداوندی کے عین مطابق سمجھ کر) سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے، المناک عذاب کی خبر سنا دو۔ (نظامِ خداوندی کے دور میں) اس مال کو، جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا (جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ ۱۰۴/۷) اور اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ ہے وہ مال جسے تم نے تنہا اپنے لئے جمع کر رکھا تھا (اور دوسروں کو اس سے محروم کر رکھا تھا۔ سو جو کچھ تم نے یوں جمع کر رکھا تھا اس کا اب مزہ چکھو۔

نہ ہی اسے اس طرح گردش میں رکھا جا سکتا ہے کہ وہ اوپر کے طبقہ ہی میں چکر لگاتی رہے۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ۔ (۵۹/۷)۔

(۶) ہنگامی ضروریات کے وقت، لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ انہوں نے اپنی ضروریات کے لئے رکھا ہے، اس میں سے بھی عطیۃً حسبِ ضرورت دیدیں۔ اسے صدقات کہا جاتا ہے۔ یہ بھی انفرادی طور پر نہیں ہوگا بلکہ نظامِ مملکت کے تابع ہوگا۔ اس لئے حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ۔ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ۔ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ (۹/۱۰۳)۔

تم ان کی مالی امداد (صدقات) قبول کر لیا کرو۔ اور مناسب تعلیم و تربیت سے ان کے قلب و دماغ کی تطہیر اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرو، اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین و ستائش سے انکی

حوصلہ افزائی کرو۔ اس سے انہیں اطمینانِ خاطر اور سکونِ قلب حاصل ہو جائے گا۔ یقیناً اللہ ہر ایک کی بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

ان ہنگامی ضروریات کی بعض مدات کی قرآنِ کریم نے خود تصریح کر دی ہے۔ جہاں کہا ہے کہ :-

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ (۹/۶۰)

صدقات کے متعلق (یعنی اس مال کے متعلق جسے مملکت رفاہِ عامہ کے لئے صرف کرتی ہے) یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی تقسیم، کسی کے ذاتی مفاد یا انفرادی جذبات کی تسکین کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ درحقیقت ان لوگوں کا حق ہے ـــ

۱۔ جو اپنی نشوونما کے لئے دوسروں کے محتاج ہوں۔ یعنی کسی وجہ سے خود کمانے کے قابل نہ ہوں۔

۲۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار یا نقل و حرکت (کسی وجہ سے) رُک گئی ہو۔

۳۔ جو لوگ صدقات (مملکت کی اس آمدنی) کی وصولی پر مامور ہوں' (ان کی کفالت کے لئے)

۴۔ جن کی تالیفِ قلوب مقصود ہو۔ (یعنی جو لوگ ویسے تو نظامِ خداوندی کی طرف آنے کے لئے تیار ہوں لیکن بعض معاشی موانع ان کے راستے میں اس طرح حائل ہوں کہ وہ انھیں اس طرف آنے نہ دیں۔ ان موانع کے دور کرنے میں ان کی امداد کی جاتے۔)

۵۔ جو لوگ دوسروں کی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں، انھیں آزادی دلانے کے لئے۔

۶۔ ایسے لوگ جو دشمن کے تاوان، یا قرض کے بوجھ تلے اس طرح دب گئے ہوں کہ اس کا ادا کرنا ان کے بس میں نہ ہو۔

۷۔ نیز' ان باہر سے آنے والوں کا جنھیں مالی امداد کی ضرورت لاحق ہو جائے۔

۸۔ ان کے علاوہ، اور جو کام بھی نظامِ خداوندی کے لئے مفید اور نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ممد و معاون ہوں، انھیں سرانجام دینے کے لئے۔

یہ خدا کے ٹھہرائے ہوتے ضوابط ہیں۔ اور اللہ کے ٹھہرائے ہوتے ضوابط علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

اس آیت میں "فی سبیل اللہ" کی مد بڑی جامع ہے۔ اس میں تمام ایسی مدات آجائیں گی جنہیں اسلامی مملکت ضروری سمجھے

(نوٹ) ہمارے ہاں ان مدات کو "زکوٰۃ کے مصارف" کہا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ قرآنِ کریم نے بالتصریح انھیں "صدقات" کی مدات کہا ہے، "زکوٰۃ" کی نہیں۔ خود "زکوٰۃ" کا مروجہ مفہوم بھی قرآنی مفہوم سے مختلف ہے۔

(۷) بنیادی طور پر پیداوار کا ذریعہ زمین ہے۔ چونکہ اسلامی مملکت نے ایتائے زکوٰۃ" کی اہم ذمہ داری پوری کرنی ہوتی ہے اس لئے یہ بنیادی ذریعۂ پیداوار (زمین) افراد کی ملکیت میں نہیں رہ سکتا۔ زمین، مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ اس سے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات یکساں طور پر پوری ہوتی رہیں۔ سورہ حٰم میں ہے:۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ - (۴۱/۱۰)

اس نے زمین میں، سطح کے اوپر، پہاڑ بنا دیئے (جن سے آب رسانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے) اور اس میں مختلف چیزوں کے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی اور چار موسموں کی تبدیلی سے اس کی فصلوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مقرر کر دیا جس سے یہاں کے رہنے والوں کو خوراک مل جائے۔

زمین کی یہ پیداوار، ہر ضرورت مند کے لئے، اس کی ضرورت کے مطابق، یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ کسی پر اس کے دروازے بند نہیں ہونے چاہئیں۔ (۳۹/۶۷ ؛ ۵۶/۶۳-۷۳)

(نوٹ) قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں اس کی صراحت موجود ہے کہ زمین، تمام انسانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ چونکہ اس کتاب میں استیعاب مقصود نہیں اس لئے تمام متعلقہ آیات کا درج کیا جانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ (ضمناً دیکھئے ۵۵/۱۰ ؛ ۵۶/۶۳-۷۳)۔ اس موضوع پر تفصیل سے دیگر کتابوں میں لکھا جا چکا ہے۔

(۸) اسلام کے معاشی نظام میں (بجز معذورین) کچھ لینے کا حقدار وہی ہے جو محنت کرتا ہے۔ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ - (۵۳/۳۹)۔ اس کا بنیادی اصول ہے۔ جیسا کہ ربٰو کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے، سرمایہ پر کچھ زیادہ لینا ربٰو ہے جو قطعاً حرام ہے اور "خدا اور رسول" کی طرف سے اعلانِ جنگ کا مستوجب۔ اصل یہ ہے کہ اس نظام میں جب کسی کے پاس زائد از ضرورت رہیگا ہی نہیں تو سرمایہ پر معاوضہ (ربٰو) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

(۹) جیسا کہ شق ۵ میں بتایا جا چکا ہے، اسلامی نظام میں، فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی۔ لہٰذا اس میں ذاتی جائیدادیں کھڑی کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں زمین، دولت، صنعت (کارخانے) تجارت وغیرہ سب امت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں۔ تاکہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں اور ان کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے۔ اور پھر یہی نظام، اپنی حدود سے آگے بڑھ کر، عالمگیر انسانیت میں بھی عام ہو جائے۔

(۱۰) اسلامی مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ قرآنِ کریم کی اس اصولی راہ نمائی کی روشنی میں، اپنے ہاں ایسا معاشی نظام قائم کرے جو ربوبیت کے ان تقاضوں کو پورا کرتا جائے، اس شرط کے ساتھ کہ اس میں کسی فرد کی ذات کی نشوونما نہ رُک جائے۔ نہ ہی اس کے شرفِ انسانیت کو ٹھیس لگے۔ یہ نظام بتدریج قائم ہوگا۔ قرآنِ کریم میں خیرات۔ وراثت وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور کے لئے ہیں جس میں ہنوز یہ نظام زیرِ تشکیل ہو اور اپنی تکمیل تک نہ پہنچا ہو۔ اسے بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ نظام ان افراد (امت) کے ہاتھوں متشکل ہوگا جو اسے اپنے ایمان کا جزو اور قلبی تقاضا سمجھیں۔ یہی اس کے قیام اور استحکام کا جذبۂ محرکہ ہوگا۔ اس جذبۂ محرکہ کے بغیر، اس قسم کا عظیم نظام نہ قائم ہو سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا۔

بنیادی حقوقِ انسانیت

۱۲

یہ وہ حقوق ہیں جو ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، بلا تفریق جنس، رنگ، نسل، مذہب وطن، قومیت، یکساں طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت ہر فردِ معاشرہ کو ان حقوق کی ضمانت دیتی ہے۔ اور اگر وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہ جائے تو افرادِ معاشرہ ان حقوق کو عدالت کے ذریعے بطور اپنے حق کے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ حقوق نمایاں طور پر حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے، یکساں عزت کا مستحق ہے۔ لہٰذا پیدائش کی نسبت سے انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے ہر انسانی بچہ کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ خدا کا ارشاد ہے۔

(۲) معاشرہ میں مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۔ (۴۶/۱۹)

ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوں گے۔

(۳) کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہو سکتا۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں ہو سکتا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب (ضابطۂ قوانین)۔ حکومت (انتظامی امور کی کارفرمائی) اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اللہ کے نہیں بلکہ اس کے محکوم بن جائیں۔

محکومی صرف خدا کے احکام کی ہوسکتی ہے۔ (اس کی تفصیل "امورِ مملکت" کے عنوان میں گذر چکی ہے)۔

اور ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوسکتا، تو وہ دوسرے انسان کا غلام کیسے ہوسکتا ہے؟ قرآن نے غلامی کے دروازوں کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔

(۴) کوئی کسی کی محنت کو سلب نہیں کر سکے گا۔ ہر کام کرنے والا اپنے کام کا پورا پورا معاوضہ پائے گا۔

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ...... (۳۹/۷۰)۔ "ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملیگا"۔

"معاوضہ" کے معنی اُجرت (WAGES) نہیں۔ اُجرتوں کا تصور تو نظامِ سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے جس کی قرآن نے جڑ کاٹ دی ہے۔ اس سے مراد، اس کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کیا جانا ہے۔ اس کی محنت کے ماحصل میں سے جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا اسے وہ بطیبِ خاطر، دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دے گا۔ مثلاً ایک کسان اگر (اپنی محنت سے) سال بھر میں سو من غلہ پیدا کرتا ہے تو وہ غلہ بیشک اس کا ہے۔ اسے، اس سے زبردستی کوئی چھین نہیں سکتا۔ لیکن وہ (اپنے ایمان کی رُو سے) اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیگا۔ جو معاشرہ مومنین پر مشتمل ہوگا اس میں ایسا ہی ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اسلامی مملکت میں معاشی نظام اسی قسم کا ہوگا۔ (تفصیل "معاشیات سے متعلق" عنوان میں آچکی ہے۔)

(۵) ہر ایک کے ساتھ عدل ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (۱۶/۹۰)۔ [عدل کسے کہتے ہیں، اس کی تفصیل متعلقہ عنوان میں آچکی ہے)۔ حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل ہوگا۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ (۵/۸) ہمیشہ عدل کرو اور دوست دشمن، ہر ایک سے ..... عدل کرو۔ یہ روش تمہیں اس معیارِ زندگی کے نزدیک تر لے آتے گی جس تک تمہیں

خدا لانا چاہتا ہے۔

(۶) عدل ہی نہیں، بلکہ جس شخص میں کوئی ایسی کمی آجائے جس کا وہ خود ذمہ دار نہ ہو، اس کی اس کمی کا پورا کرنا بھی۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ (۱۶/۹)۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ فِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ۔ (۷۰/۲۴)۔ جو کسی طرح بھی ذی احتیاج ہو، یا کام کرنے کے قابل نہ رہے، معاشرہ کی دولت میں اس کا حصہ بطور حق کے ہے۔

(۷) حقِ رزق — یعنی تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا، اس نظامِ معاشرہ کے ذمہ ہے جو خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے۔ وہ اعلان کرے گا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)۔ "ہم تمھاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمھاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔"

(۸) جان کی حفاظت۔ [بجز ایسی صورت میں جس کی تصریح قرآن نے کر دی ہو (۶/۱۵۲)۔ اس کی تشریح پہلے گذر چکی ہے]

(۹) مال کی حفاظت۔ یعنی ہر وہ شے جسے قانون کی رُو سے کسی کی ملک قرار دے دیا گیا ہو۔ اس کی حفاظت۔ (۴/۲۹)۔ [تفصیل اس کی "حفاظتِ مال" کے عنوان میں گذر چکی ہے]

(۱۰) سکونت کی حفاظت۔ سورہ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کے گھروں اور بستیوں سے نکال دینا جرم ہے۔ (۲/۸۵)۔

(۱۱) عصمت کی حفاظت۔ (۲۴/۲)۔ [تفصیل زنا کے عنوان میں آچکی ہے]

(۱۲) حسنِ ذوق کا حق۔ یعنی قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے، ذوقِ جمالیات کی تسکین کا حق۔ قرآن کریم نے نہایت تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (۷/۳۲)۔ "اے رسولؐ! ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو سامانِ آرائش و زیبائش (زیب و زینت) اور خوشگوار اشیائے خور و نوش کو، جنھیں خدا نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، حرام قرار دیدے"۔ (نیز دیکھئے ۷/۲۶ ۷/۳۱)۔ قرآن کریم نے جنّت کی زندگی کو تمثیلی زندگی (IDEAL LIFE) قرار دیا ہے۔ دیکھئے! اس میں سامانِ زیبائش و آرائش کی کس قدر تفصیل دی گئی ہے۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا۔ مُّتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ۔ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا۔ وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا. قَوَارِيرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا. (۷۶/۱۲-۱۶ و دیگر آیات)

یہ جنتی زندگی، ان کے استقلال و استقامت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں وہ بڑی آسائش و توانائی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ شادابیوں کے باغات اور حرارت بخش و حریت افزا فضائیں۔ اس میں وہ اقتدار و اختیار کی مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ وہاں نہ سخت گرمی ہو گی نہ سخت سردی۔ (ہمیشہ بہار کا موسم رہے گا)۔

چاروں طرف سے گھنے درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوں گے اور ان کی شاخیں پھلوں سے لدی ہونگی۔ سامانِ زیست و راحت کی کوئی شے ان کی دسترس سے باہر نہیں ہو گی۔ اسے حاصل کرنے کے لئے انہیں جانکاہ مشقتیں نہیں اٹھانی پڑیں گی، بلکہ وہ خود ان کی طرف جھک کر آجائیں گی۔ چاندی کے برتنوں میں کھانے، بلوریں آبخوروں میں مشروبات۔ یہ سب ان کے گرد گردش کریں گے۔ خود چاندی کی چمک بلور جیسی ہوگی۔ اور یہ سب برتن اور آبخورے، ٹھیک ٹھیک اندازے اور پیمانے کے مطابق بنائے گئے ہوں گے۔

واضح رہے کہ اسلامی نظام میں یہ تمام اشیاء ہر ایک کو حاصل ہونگی کسی ایک طبقہ کو نہیں۔ جنت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس میں امیروں اور غریبوں کے الگ الگ طبقات ہوں گے۔

(۱۳) مذہبی آزادی کا حق۔ یعنی اس بات کا حق کہ انسان جس مذہب کو جی چاہے اختیار کرے اور جسے جی چاہے چھوڑ دے۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ (۲/۲۵۶)۔ اور اس مضمون کی دیگر متعدد آیات قرآن میں موجود ہیں۔ تفصیل اسکی "امورِ مملکت" کے ذیلی عنوان "غیر مسلموں کی پوزیشن" میں گذر چکی ہے۔ ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت بھی ان کا بنیادی حق ہے۔ سورۂ حج میں ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا۔ (۲۲/۴۰)۔

اور اگر اللہ اس کا انتظام نہ کرتا کہ ایک گروہ کی روک تھام دوسرے گروہ کے ذریعے ہو سکے (اور وہ سرکش لوگوں کو بد لگام چھوڑ دیتا کہ وہ جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں، تو اور چیزیں تو ایک طرف) کسی قوم کی عبادت گاہ تک بھی دنیا میں محفوظ نہ رہتی ــــ خانقاہیں، گرجے، یہودیوں کے معبد، مساجد، جن میں

خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ـــــ سب، کبھی کے ڈھلئے جا چکے ہوتے۔
واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مرتد (اسلام چھوڑ کر کسی اور مذہب کو اختیار کر لینے) کی کوئی سزا نہیں۔ جب آزادیٔ مذہب اس کا بنیادی اصول ہے تو تبدیلیٔ مذہب کی سزا کیسی؟

(۱۴) مظلوم کو فریاد کا حق۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (۴/۱۴۸) "اللہ کسی بُری بات کی تشہیر پسند نہیں کرتا، بجز مظلوم کے (جسے اس کا حق حاصل ہے کہ اپنے اوپر ظلم اور زیادتی کی فریاد کرے)۔

(۱۵) اس بات کا حق کہ کوئی کسی دوسرے کی ذمہ داری کو نہیں اٹھائے گا۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (۶/۱۶۵) "جو کرے گا وہی بھرے گا اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" اس کا بنیادی اصول ہے۔

ان کے علاوہ کچھ ایسے حقوق ہیں جو قانون کے دائرے کے اندر آتے ہیں۔ ان کا ذکر متعلقہ عنوانوں میں آچکا ہے۔

ان حقوق کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ایسا قانون جو ان حقوق کو سلب کرتا ہو، خلافِ قرآن ہوگا۔ نیز اگر کوئی نظامِ معاشرہ ان حقوق کو پورا نہیں کرتا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکے گی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میرے مجموعۂ مضامین "بہارِ نَو" میں انسانی حقوق سے متعلق عنوان۔)

جُرم اور سزا کا باہمی تعلّق

ضابطۂ قرآنی قوانین کی تفصیلات تو ختم ہو گئی ہیں لیکن یہ سوال مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے جرم اور سزا میں باہمی تعلق کیا ہے اور سزا کا فلسفہ کیا؟ اس سوال کے جواب میں میرا ایک مختصر سا مقالہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا متعلقہ حصہ یہاں بھی درج کر دیا جائے تاکہ یہ عنوان اس زاویۂ نگاہ سے بھی مکمل ہو جائے۔

—————(۰)—————

جُرم اور سزا

قرآنِ کریم میں دو قسم کے احکام ملیں گے — ایک اخلاقی اور دوسرے تعزیری۔ تعزیری سے مراد ہیں ایسے احکام جنھیں جُرم قرار دیا گیا ہو۔ اور اخلاقی احکام سے ایسے احکام مراد ہیں جن کی خلاف ورزی معاشرتی جُرم قرار نہ پائے۔ مثلاً لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا۔ (۱۷/۳۷)۔ (زمین میں اکڑ کر نہ چلو) قرآن کا حکم ہے۔ لیکن یہ ایسا حکم نہیں جس کی خلاف ورزی معاشرہ کا جُرم قرار دیا جائے۔ اسی صورت میں دوسرا حکم ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى (۱۷/۳۲) "زنا کے قریب مت جاؤ"۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی معاشرتی جرم ہو گی۔

واضح رہے کہ احکام کی اخلاقی اور تعزیری تقسیم محض زیرِ نظر سوال کے سمجھنے کے لئے کی گئی ہے۔ ورنہ قرآنِ کریم کے ہر حکم کی بنیاد اصلاحِ اخلاق پر ہے اور اخلاق سے مراد ہے انسانی ذات کی نشوونما کے ذرائع۔

۲۔ تعزیری احکام بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی سزا بھی قرآن نے خود ہی تجویز کر دی ہے۔ (مثلاً زنا) اور دوسرے وہ جن کی سزا اس نے خود تجویز نہیں کی بلکہ اسے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ، حالات کے مطابق، ان کی سزا خود متعین کرے۔ مثلاً اس نے الخمر (عرفِ عامہ میں شراب) کے استعمال سے منع کیا ہے لیکن اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا مقرر نہیں کی۔

یہ مسئلہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآنِ کریم نے جن احکام کی سزا خود مقرر نہیں کی، ان میں سے کون کون سے ایسے ہیں جنھیں تعزیری احکام کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب کوئی ایک فرد نہیں دے سکتا۔ نہ ہی کسی فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی حکم کی خلاف ورزی کو معاشرتی جرم قرار دے کر اسے مستوجبِ سزا ٹھہرائے۔ یہ فیصلہ اسلامی مملکت کے کرنے کا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو فیصلے اسلامی مملکت کرے گی۔ ان میں وقتاً فوقتاً (بہ تقاضائے حکمت) تبدیلیاں کی جا سکیں گی۔

احکام ہی نہیں۔ قرآنِ کریم نے جن امور کو بطورِ اصول بیان کیا ہے یا جو حدود مقرر کی ہیں، ان کی خلاف ورزی کی مخصوص شکلوں کو جرم قرار دینا بھی اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ "حدود" کا لفظ میں نے فقہی اصطلاح — حدؔ — کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس سے مراد ہے اعمال کا وہ دائرہ جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے لیکن جس سے تجاوز کرنا منع ہے۔ حدود اور اصول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

۳۔ اسلامی نظام کا فریضہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرے جس میں ہر فرد اپنے ہر بنیادی حق، اپنی ہر متاعِ زیست کو اس طرح محفوظ سمجھے کہ اسے اس باب میں ذرا سا تردّد، فکر یا تشویش لاحق نہ ہو۔ اسے اس کے متعلق پورا پورا اطمینان اور یقین کامل ہو۔ قرآنی نظام کا لازمی نتیجہ اس قسم کی فضا کا وجود میں لانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸)۔ اس میں انہیں "نہ خوف ہوگا نہ حزن"۔ وہ اس فضا کو قرآنی اقدار کے مطابق تعلیم و تربیت اور افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے فکر کر دینے سے پیدا کرتا ہے۔

ؔ فقہ کی رو سے حدؔ قرآنِ مجید کی مقرر کردہ سزا کو کہتے ہیں اور تعزیرات ان سزاؤں کو جنہیں قرآنِ کریم نے مقرر نہیں کیا۔ فقہ نے مقرر کیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو "نفسیاتی مریض" ہوں اور ان کا "پاگل پن" افرادِ معاشرہ سے امن و اطمینان کا احساس چھین لے۔ ایسے مریضوں کا علاج ضروری ہے۔ اور جب تک وہ پورے طور پر شفایاب نہ ہوں، افرادِ معاشرہ کو ان کے جنون کے پیدا کردہ خطرات سے محفوظ رکھنا از بس لازمی۔ یہ علاج اکثر بیشتر ان مریضوں (مجرموں) کی قلبی اور ذہنی اصلاح سے ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس کے لئے بطور آخری اقدام تخویف و ترہیب کی بھی ضرورت پیش آتی ہے — کئی نفسیاتی امراض ایسے ہیں جن کا علاج خوف کی احساس ہی سے کیا جاتا ہے — اس طریقِ علاج کو سزا کہا جاتا ہے۔ اس سے مقصد اولاً خود اس مجرم کی اصلاح ہوتی ہے اور ثانیاً ان کی اصلاح جن کے تحت الشعور میں ارتکابِ جرم کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں۔ سزا بطورِ انتقام کا تصوّر غیر قرآنی ہے۔

یہ تو رہا سزا کا ایک مقصد۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مجرم نے جس شخص کو نقصان پہنچایا ہے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کے ہاں چوری کی ہے۔ اگر عدالت نے اس مجرم کو دس سال قید کی بھی سزا دے دی تو اس سے اس مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص کا نقصان پورا کیا جائے۔ اگر مالِ مسروقہ برآمد ہو گیا ہے تو اسے واپس دلایا جائے۔ اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو نظامِ معاشرہ اسے خود مہیا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ قرآنی تصوّرِ "جرم و سزا" کی رو سے مستغیث، مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا۔ وہ نظامِ معاشرہ (حکومت) کے خلاف مدعی ہوتا ہے۔ معاشرہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کرے گا۔ اگر اس متاع پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ معاشرہ نے اس شخص سے وعدہ خلافی کی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک 'مجرم' نظامِ معاشرہ ہے نہ کہ وہ خاص فرد جس نے ارتکابِ جرم کیا ہے۔ یہ نظامِ معاشرہ کے دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ اس نقصان کو مجرم سے پورا کراتا ہے یا خود پورا کرتا ہے۔ مظلوم کو اس سے واسطہ نہیں۔ نظامِ معاشرہ کا فریضہ مظلوم یا اس کے وارثوں کا پشت پناہ بننا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطٰنًا ...... اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۔ (۱۷/۳۳)۔ اگر نظامِ معاشرہ مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں کرتا، تو وہ اس کا پشت پناہ کیسے بن سکتا ہے اور حامی و ناصر ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر نقصان کی تلافی روپے سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن نظامِ معاشرہ کو بہرحال اس کی تلافی کی شکل پیدا کرنی ہو گی (بشرطیکہ وہ نقصان اس شخص کی اپنی غفلت یا تساہل کی وجہ سے نہ ہوا ہو) — اس کی تلافی بھی کرنی ہو گی اور اس کے ساتھ اس کا انتظام بھی کہ آئندہ معاشرہ

میں ایسا نہ ہو۔

۴۔ اوپر کہا گیا ہے کہ تعزیری سزاؤں سے مقصود یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے نفسیاتی مریضوں کا علاج ہو جائے نفسیاتی علاج کی کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ مریض کو مرض کا احساس ہو جائے۔ یعنی مجرم دل سے اعتراف کرے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مجرم کے دل میں فی الواقعہ یہ احساسِ ندامت بیدار ہو جائے تو اس کی اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ "سزا دینے" کے بجائے معاف کر دیتا ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ وہ شخص اپنی اصلاح کرے۔ اور ایسا کرنے میں معاشرہ اس کی ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سزا سے پہلے عفو (درگذر کر کے اصلاح کرنے) کی گنجائش رکھی ہے۔ وہ سزا اس صورت میں تجویز کرتا ہے جب مجرم میں اس کے سوا اصلاح کا امکان نہ رہے۔

(۵) قرآنِ کریم، بدنی سزائیں (CORPORAL PUNISHMENTS) تجویز کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ چور کو جیل خانے بھیج دے جہاں اسے روٹی کپڑا ملتا رہے اور اس کے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں۔ یعنی جرم وہ کرے اور سزا یہ بے گناہ بھگتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خوف جس سے عادی مجرموں کی اصلاح کا امکان ہو سکتا ہے یا جس سے امکانی مجرموں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھا جا سکتا ہے، بدنی سزا ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

۶۔ اب ان اصولوں کو دیکھیے جنہیں قرآنِ کریم اس باب میں بنیادی قرار دیتا ہے۔

۱۔ قصاص:۔ اس کے معنی جرم کی سزا دینا نہیں۔ اس کے معنی ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ رہ جائے۔ یعنی قرآنی نظام میں کسی مجرم کو (UNTRACED) نہیں رہنا چاہیے۔ وہ اس قسم کے محکم نظامِ تفتیش میں حیاتِ اجتماعیہ کا راز بتاتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (۲/۱۷۹)۔

۲۔ عدل:۔ یعنی فیصلہ کرتے وقت مجرم کی پوزیشن، عدل کے تقاضے پر کسی طرح اثر انداز نہ ہونے پائے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ۔ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ (۲/۱۷۸) کا اصول ہمیشہ کار فرما ہے۔

۳۔ جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۴۲/۴۰)۔ یہ بھی اس صورت میں جب اس کے بغیر اصلاح کا امکان نظر نہ آئے۔

۴۔ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے، ملزم کو بے گناہ سمجھنا اور معاشرہ کو اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لینا

چاہیئے۔ سورۂ نور میں ہے کہ مدینہ میں بعض لوگوں نے کسی عورت کے خلاف تہمت تراشی کی اور لوگ اسے لے اڑے۔ اس پر قرآن کریم نے یہ ہدایت دی کہ تم نے جب یہ افواہ سنی تھی تو تمہارا ردِّعمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ... وَ بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (۱۶-۱۲/۲۴)۔ یہ ایک مستقل راہ نمائی ہے کہ ملزم کے متعلق سوءِ ظن سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

۵۔ کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہوگیا ہو جو اس قانون کے خلاف ہو، تو اسے جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر کسی قانون کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے نہیں ہوسکتا۔ اس کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد سے ہوگا۔ قرآن کریم میں کئی ایک احکام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ (۲۲/۴)۔ جو اس سے پہلے ہوگیا اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

۶۔ جس فعل کے ارتکاب میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو (یعنی عمدًا نہ کیا گیا ہو) اس پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ سورۂ احزاب میں ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۔ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (۳۳/۵)۔ جو کچھ تم سے سہوًا ہو جائے اس پر مواخذہ نہیں۔ مواخذہ اس پر ہے جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔

لیکن لاپرواہی بھی الگ جرم ہے اور قابلِ سرزنش۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے قتلِ خطا (سہوًا) کی سزا بھی تجویز کی ہے اگرچہ وہ سزا جرمِ قتل کی نہیں، بطور کفارہ کے ہے (۴/۹۲)۔

۷۔ بڑے بڑے جرائم سے بچنے والوں سے اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہوجائے تو وہ قابلِ معافی ہوتی ہے — سورۂ النجم میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ (۵۳/۳۲)۔ جو لوگ بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں ان سے اگر کوئی معمولی سی لغزش ہوجائے تو قابلِ عفو ہے۔

۸۔ سزا تجویز کرتے وقت مجرم کی ذہنی سطح، تعلیم و تربیت اور معاشرتی احوال و کوائف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے (اس زمانے کی) لونڈیوں کی جرمِ زنا کی سزا شریف عورتوں سے نصف قرار دی (۴/۲۵)، کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتی تھیں اس کے پیشِ نظر ان سے بلند اخلاق کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس، رسول اللہ کے گھرانے کی خواتین سے کہا گیا کہ اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہوا تو اس کی دگنی سزا ہوگی۔ (۳۳/۳۰)

۹۔ قرآنِ کریم جس قسم کا معاشرہ قائم کرتا اور اس میں افرادِ معاشرہ کی تربیت جس انداز سے کرتا ہے اس سے وہ

توقع رکھتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے گی تو وہ خود اس کا اعتراف کرے گا اور صحیح صحیح بات کہہ دے گا۔ خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (۴/۱۳۵)۔ اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے شہادت کے سلسلے میں ایسا بلند اصول پیش کیا ہے جس کی موجودگی میں عدل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی (اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)۔

۱۰۔ قرآن مجید کے پیشِ نظر مجرم کی اصلاح ہے۔ اس لئے وہ اس کے دل میں جرم کے مذموم ہونے کا احساس بیدار کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک عجیب و غریب اصول پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ۔ (۴/۱۱۱)۔ جو کسی کے خلاف ظلم و زیادتی کرتا ہے وہ بزعمِ خویش سمجھتا ہے کہ اس نے اس سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے، اور اس کا نقصان خود اس کی ذات کو ہوتا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ جرم سے خود مجرم کی ذات پر ایسا نقصان رساں اثر پڑتا ہے جس کی تلافی کسی خارجی سزا سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر مجرم کسی ترکیب سے اپنے آپ کو سزا سے بچا لے، تو بھی اس سے جو نقصان اس کی ذات کا ہوا ہے وہ اس سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات وہ ہے يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ۔ (۴۰/۱۹)۔ جو نگاہ کی خیانتوں اور دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔ یہ ہے وہ تعلیم جس سے وہ مجرم کے دل میں احساسِ ندامت بیدار کرتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو اسے سزا دینے کے بجائے اصلاح کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

———— (۰) ————

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر کسی مجرم کو عدالت سے سزا مل جاتی ہے تو کیا وہ اس سے آخرت کے مواخذہ سے چھوٹ جاتا ہے؟ اس کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آخرت کا مواخذہ کہتے کسے ہیں؟ انسان کے ہر عمل (حتیٰ کہ خیال تک) کا اثر اس کی ذات پر ہوتا ہے اور انہی اثرات کے مجموعی نتیجہ کے مطابق اُس کی اُخروی زندگی مرتب ہوتی ہے۔ مجرم کے جرم کا ایک اثر سوسائٹی پر پڑتا ہے اور دوسرا اثر خود اس کی ذات پر۔ عدالت کی طرف سے ملی ہوئی سزا سوسائٹی کے خلاف جرم کا توازالہ کر دیتی ہے لیکن اس جرم کا جو اثر مجرم کی ذات پر مرتب ہوا تھا اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اس کی

تلافی اسے خود کرنی ہوگی۔ اس کے لئے احساسِ ندامت پہلا مرحلہ ہے جس کا نتیجہ توبہ ہوتا ہے۔ یعنی آئندہ کے لئے اس جرم سے محتاط رہنے کا تہیہ۔ اس کے بعد اصلاح کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی ایسے تعمیری کام کرنا جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے جو اس جرم کے ارتکاب سے اس کی ذات کو پہنچا تھا۔ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔ (۱۱/۱۱۴)۔ قرآنِ کریم کے قانونِ مکافات کا بنیادی اصول ہے — یہ ہے وہ طریق جس سے مجرم "آخرت کے مواخذہ" سے بچ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل (آخرت) پر ایمان ہو اس سے جرم سرزد ہی بہت کم ہوتا ہے۔